قادر نامہ غالب ۔ مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی صاحب تقطیع خورد

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۲، قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسے ۔

پتہ: شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال ۔

جناب عبدالقوی دسنوی صدر، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، غالب پر متعدد تحقیقی مضامین اور کتابچے لکھ چکے ہیں، اب انھوں نے قادر نامہ غالب کا متن ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، یہ مختصر اور دلچسپ منظوم کتاب مرزا نے اپنے متبنی عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسن علی خاں کے لیے لکھی تھی، گو اس کے متعدد اڈیشن شائع ہوچکے ہیں لیکن عبدالقوی دسنوی صاحب نے اس کو اس پروگرام کے مطابق شائع کیا ہے جو شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے بچوں کو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ہم معنی الفاظ سکھانے کے لیے بنایا ہے، اور جس کے الحت وہاں سے اس نوع کی اور کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں، شروع میں لائق مرتب کے قلم سے ایک مختصر وجامع پیش لفظ بھی ہے، اس میں قادر نامہ کے غالب کی تصنیف ہونے کے دلائل تحریر کیے گئے ہیں، امید ہے غالب کے قدر دانوں کے حلقے میں یہ کتاب پسند کی جائے گی ۔

نقشہائے رنگ رنگ ۔ مرتبہ جناب عطا کاکوی صاحب، تقطیع خورد

کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۹۶ قیمت ۳ روپیہ پتہ: عظیم الشان بکڈپو سلطان گنج، پٹنہ ۶ ۔

یہ غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر انتخاب ہے، جو غزلیات، قطعات، قصائد، رباعی مثنوی اور خمسہ وغیرہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، مرزا کو اپنی فارسی شاعری پر زیادہ ناز تھا، اس حیثیت سے انکے فارسی کلام کی یہ قدردانی لائق تحسین ہے، مگر اس کی قیمت زیادہ ہے ۔

"ض"

جلد ۱۰۸ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۱ء عدد ۵

مضامین

تصحیح گذشتہ مہینہ جمیل احمد صاحب ناگپور کے نام سے جو غزل شائع ہوئی ہے وہ محمد شرف الدین صاحب ساحل کی ہے، غلطی سے جمیل احمد صاحب کے نام سے شائع ہوگئی ہے، مقطع میں "محفوظ ہی" کے بجائے "محفوظ رہے" چھپ گیا ہے، ناظرین تصحیح کرلیں ۔ "م"

شذرات

افسوس ہے کہ مشہور ماہر تعلیم سید اسد اللہ صاحب کاظمی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند تھے، حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے استاد رہے، پھر صوبہ متحدہ کے محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے، اور ڈپٹی ڈائرکٹری کے عہدہ تک پہنچے، اسی زمانہ میں ریاست کشمیر کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوگئے، ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد یونسکو کی طرف سے کئی سال تک حکومت بغداد کے مشیر تعلیم رہے، اس طرح ان کی پوری عمر تعلیمی تجربات میں گذری، مسلمانوں میں وہ ماہر تعلیم مانے جاتے تھے، ان کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی، اور ان کی تعلیمی تنظیموں کو اپنے تجربات اور مفید مشوروں سے فائدہ پہنچاتے تھے، علم و ادب کا بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، مذہبی مطالعہ بھی وسیع تھا، راسخ العقیدہ پابند مذہب مسلمان تھے، کلام مجید کے مطالعہ کا خاص ذوق تھا، بغداد کے قیام کے زمانہ میں کچھ عربی بھی سیکھ لی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا، عالم آخرت کی نعمتوں سے بھی سرفراز فرمائے،

دوسرا حادثہ اردو کے بزرگ شاعر انظر موہانی کی وفات کا ہے، اپنے معاصرین میں وہ ممتاز گنے جاتے تھے، ان کی عمر کا اب کوئی شاعر زندہ نہیں ہے، وفات کے وقت ۔۔ سال کی عمر تھی، وہ استاد فن تھے، پرانے اساتذہ کی طرح زبان کی باریکیوں پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اور شاعری میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، ان کے دامن تربیت میں بہت سے شعراء پلے، ان کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا، صاحب قلم بھی تھے، ایک زمانہ میں ایک سالہ جام جہاں نما کے نام سے نکالتے تھے، مگر عرصہ سے لکھنا چھوٹ گیا تھا، مگر مشق سخن برابر جاری تھی، کبھی کبھی معارف میں بھی اپنا کلام بھیجتے تھے، حاجی وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، انکی یادگار میں ہر سال

بڑے اہتمام سے مشاعرہ کرتے تھے، انکی موت سے ایک استاد فن شاعر اٹھ گیا، رمضان المبارک میں موت یوں بھی ذریعۂ مغفرت ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مزید رحمتوں سے نوازے،

عارف عباسی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، وہ اس دور کے ممتاز غزل گو اور جگر کے طرز کے کامیاب مقلد تھے، انھوں نے اپنی ظاہری وضع قطع بھی انہی کی جیسی بنائی تھی، ان کا مکان اعظم گڈھ سے متصل ضلع بلیا میں تھا اسلئے اعظم گڈھ میں ان کے پرانے تعلقات تھے اور یہاں برابر ان کی آمد و رفت رہتی تھی پہلے جب اعظم گڈھ آنا ہوتا تھا تو دارالمصنفین ضرور آتے تھے اور اپنے تازہ کلام سے محظوظ کرتے تھے، مگر ادھر کچھ دنوں سے اس وضعداری میں فرق آگیا تھا، عرصہ تک ان کی غزلیں معارف میں چھپتی رہیں، ان کے تغزل میں بڑی لطافت و پاکیزگی تھی، ابتدا میں راجہ صاحب نانپارہ کے لڑکوں کے اتالیق رہے تھے، اسلئے درباری آداب اور علم مجلس کے بڑے ماہر تھے، ان کی عمر ساٹھ باسٹھ سال کی رہی ہوگی، ادھر کچھ دنوں سے کچھ قلبی شکایت ہوگئی تھی، اسی نے مرض الموت کی شکل اختیار کرلی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

اتر پردیش کی حکومت نے جو اردو اکیڈمی قائم کی ہے، بعض حلقوں میں اس کا بڑا خیر مقدم ہو رہا ہے، اور اس سے اردو کے بارہ میں بڑی امیدیں قائم کی جارہی ہیں، اکیڈمی کے جو اغراض و مقاصد شائع ہوئے ہیں، اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اب اردو سے عناد باقی نہیں رہا، اگر ان مقاصد پر عمل ہو، تو اردو کو پنپنے کا کچھ موقع مل سکتا ہے، پہلے اردو کے نام سے جو تھی، اردو کتابوں پر انعامات اور ان کی طبع و اشاعت اور اردو لائبریریوں میں ان کی خریداری کے لئے جو حقیر رقم ملتی تھی، وہ بھی ہندی کے طفیل میں مگر اب ان کاموں کے لئے ایک معقول رقم اردو کے نام سے مخصوص کردی گئی ہے، باقی اردو کی بقا و ترقی کے وسائل اور اس سے متعلق شکایتوں کے ازالہ وغیرہ کے بارہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں، اصل سوال ان پر عمل کا ہے، ورنہ اس قسم کے وعدے تو ہر حکومت

کرتی چلی آئی ہے، جن پر آج تک عمل نہیں ہوا، اب اکیڈمی کے ذریعہ اس کا تجربہ کرنا ہے،

اُردو کا اصل مسئلہ اُس کی تعلیم کا ہے، جبتک ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں اس کا قابلِ اطمینان انتظام نہیں ہوتا، اس قسم کی اکیڈمیوں کے قیام سے کوئی بڑا فائدہ نہیں، اُردو کے مطالبات سے حکومت پوری طرح واقف ہے، مرکزی انجمن ترقی اُردو اور دوسری مجالس ان کو بار بار پیش کر چکی ہیں، اگر واقعی حکومت اُردو کے معاملہ میں مخلص ہے تو ان مطالبات کو مان کر اس کا ثبوت دینا چاہئے، ورنہ کم سے کم اُردو کو جو حقوق بھی ملیں اُس کی حیثیت قانونی ہونی چاہئے، محض اُردو اکیڈمی کے قیام سے اُردو زندہ نہیں رہ سکتی،

اگر اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر عمل درآمد ہو تو بھی غنیمت ہے جو بڑی حد تک اُردو کے ساتھ اُس کے ممبروں اور عہدہ داروں کی ہمدردی اور دلچسپی پر موقوف ہے، ممبروں کے نام کا تو ابھی اعلان نہیں ہوا ہے، اس کے صدر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی اور سکریٹری تربھون پرشاد ہوئے ہیں جن کو اُردو سے کوئی تعلق نہیں، اگر اکیڈمی کے ذریعہ واقعی کچھ کرنا ہے تو ان دونوں عہدوں کے لئے ایسے اشخاص کا انتخاب ہونا چاہئے جو اُردو سے پوری طرح واقف ہوں اور جن کو اس سے ہمدردی بھی ہو، سرکاری آدمی کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لحاظ سے صدارت کے لئے سب سے موزوں شخصیت پنڈت آنند نرائن مُلا کی ہے، سکریٹری کے عہدہ کے لئے بھی ایسے اشخاص مل سکتے ہیں، ایک نام تو حیات اللہ صاحب انصاری کا ہے، جن کی حیثیت سرکاری بھی ہے، اور وہ اردو کے مشہور وکیل اور ادیب بھی ہیں

مقالات

اقبال کی تعلیمات پر ایک نظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

مسلمانوں کا منصب و مقام

یہ سارا معجزہ اسلام کا تھا، اسی نے اُن میں زندگی کی روح پھونکی تھی - اور اسی کے بدولت انھوں نے دنیا میں سربلندی حاصل کی، اس لئے جب سے اس کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا دین کے ساتھ دنیا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور حکومت و اقتدار، علم و فن اور تہذیب و تمدن بھی اُن سے رخصت ہو گئے، اور وہ دنیا میں ایک فلاکت زدہ قوم بن کر رہ گئے - اور جن قوموں کی انھوں نے امامت کی تھی - خود اُن کے غلام بن گئے، اقبال اور حالی دونوں نے اس زبون حالی کا ماتم کیا ہے - لیکن اقبال نے ماتم کے ساتھ مسلمانوں کے امراض اور اُن کے زوال کے اسباب کی تشخیص کر کے اس کا علاج بھی بتایا ہے، اور ان پر زندگی کے اسرار و رموز ظاہر کر کے دوبارہ اُن میں روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، ان کا پورا کلام اس روح سے معمور ہے، وہ مسلمانوں کی زبون حالی پر اُن کو دل شکستہ اور مایوس نہیں کرتے، بلکہ ان کا اصلی منصب و مقام

بتاکر ان میں زندگی کا جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں:-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو   قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں ہے تو
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو   دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا   جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ   تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت   اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا   ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا   دانہ تو کھیتی بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے   راہ تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفان سے   ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا   مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو   خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے   (شمع و شاعر)

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:-

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے   یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی   ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا   خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنابندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا   تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر   نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا   (طلوعِ اسلام)

ایمان و یقین

اس منصب و مقام کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ اقبال نے آخری شعر میں اشارہ کیا ہے، یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنے میں وہ اوصاف پیدا کریں، جنھوں نے اُن کو دنیا میں سربلند کیا تھا، اور جن کی بدولت وہ صدیوں تک تمام دنیا کی قوموں کی امامت کرتے رہے، یہ وصف اسلام سے شیفتگی اور اس کی تعلیمات پر عمل سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نام ہے چند حقائق پر یقین واثق، اذعانِ کامل، اُن کے مطابق عمل، اور اس کے لئے ایثار و قربانی کا، اس راہ میں جو مشکلات و مصائب بھی پیش آئیں اُن کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے، اگر جان دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو بھی بلا تکلف نثار کر دیا جائے، اور اس کو سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑی کامیابی سمجھا جائے،

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

چنانچہ شہادت کے موقع پر صحابۂ کرام کی زبان سے بے اختیار "فزت برب الکعبۃ" نکل جاتا تھا،

اسلام تو ایک وسیع نظامِ حیات ہے جس سے زندگی کا کوئی گوشہ باہر نہیں ہے، لیکن اس کا اصل الاصول توحید اور اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے، یہ کہنے کو تو دو لفظ ہیں، لیکن اسلام کی ساری تعلیمات اور نظام کا خلاصہ اس میں آ جاتا ہے، توحید ہی وہ منبع ہے جس سے انسانی فوز و فلاح کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں، توحید کے معنی یہ ہیں کہ

غیراللہ کا خوف بالکل دل سے نکل جائے توحید انسان میں ایسی قوت پیدا کر دیتی ہے کہ پھر وہ دنیا کی کسی طاقت کو نگاہ میں نہیں لاتا، اعلاء کلمۃ اللہ کے معنی ہیں دنیا میں نیکی اور بھلائی کی تبلیغ، اور اس کا عملی نفاذ اور قیام؛ اس بارِ گراں کی حامل امت اسلامیہ ہے، دنیا کا کوئی نظام کوئی فلسفہ موجودہ اصطلاح میں کوئی ازم بھی اس پر ایمان و یقین کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، بلکہ اسلام نام ہی ہے چند ابدی صداقتوں پر یقین واثق کا، اس فلسفہ کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے،

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں — ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

دین و دنیا کی تمام کامیابیوں کا راز اسی ایمان و یقین پر ہے،

گمان آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا — تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
ولایت، بادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(طلوع اسلام)

عمل اور جوشِ کردار کسی مقصد سے شیفتگی کا لازمی نتیجہ اس کے لئے عملی جدوجہد ہے، اسی

سے قوموں کی تقدیر بنتی اور بگڑتی ہے جنت وجہنم بھی عمل ہی کا نتیجہ ہے،

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

انسان بڑے بڑے کارنامے جوشِ عمل ہی کے بدولت انجام دیتا ہے، اسی سے میدانِ جہاد میں مرد مومن کی تکبیر خدا کی آواز بن جاتی ہے،

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صف جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

زندگی کا فلسفہ ایک نظم میں انھوں نے حضرت خضر کی زبان سے قوموں اور ملتوں کی موت و حیات کا پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے، جس میں زندگی کے اہم عناصر آگئے ہیں،

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعل و گہر پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر — رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے (خضرِ راہ)

عشق کی عظمت

اقبال نے عشق کو بڑے وسیع اور مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے ان میں قدرِ مشترک کسی اعلیٰ و برتر مقصد سے والہانہ شیفتگی اور اس کے لئے جان فروشی و جان سپاری ہے، ہر مقصد اور نصب العین کی کامیابی کے لئے خواہ دینی ہو یا دنیاوی والہانہ لگن ضروری ہے، یہی لگن انسان میں وہ جذبہ و قوت پیدا کرتی ہے جس سے وہ اس راہ میں ہر قربانی اور اپنا سارا خانماں لٹانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، مغربی قومیں مادی ترقی کے لئے کیسی کیسی قربانی اور جانفروشی کرتی ہیں دین کا جذبۂ عشق تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، "الذین آمنوا اشد حباً للہ" اس کی راہ میں موت بھی حیاتِ ابدی ہے "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء عند ربھم" اس عشق کی بدولت انسان ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے، جو عام طاقتِ بشری سے باہر ہیں، جب تک مسلمانوں میں اسلام کے ساتھ یہ جذبۂ عشق رہا، انھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے۔ اور صدیوں دنیا کے بڑے حصہ پر حکمراں رہے، اور دوسری قوموں کو علم و عرفان اور تہذیب و تمدن کا درس دیتے رہے، جب سے یہ جذبہ سرد پڑا، ان پر زوال طاری ہو گیا، اور وہ خود ان قوموں کے غلام بن گئے۔ اس لئے اقبال نے بڑے موثر

اور رنگارنگ پیرایوں میں اس جذبۂ عشق کی عظمت و اہمیت بیان اور اس کو دوبارہ مسلمانوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے نزدیک عشق کی اصل اس دنیا کے عناصر سے ماورا، اور اس کی قوت بے پناہ ہے، اس کی نگاہ سے سنگ خارا کا جگر شق ہو جاتا ہے، عشق خود سراپا حق اور اس کی قوت حق کی قوت بن جاتی ہے، اس کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہو جاتا ہے، جب انسان کی خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے، تو اس کی طاقت سارے عالم کی حکمراں اور سارے دنیا کے جھگڑوں میں حکم اور دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ اور حکومتیں اس کی تابع فرمان بن جاتی ہیں،

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست
از نگاہِ عشق خارا شق شود — عشقِ حق آخر سراپا حق شود
از محبت چوں خودی محکم شود — قوتش فرمان دہِ عالم شود
در خصوماتِ جہاں گردد حکم — تابعِ فرمانِ او دارا و جم

دونوں عالم عشق کے آثار سے معمور ہیں، عشق ہی کی بدولت بنی آدم خلافتِ ارضی کا مستحق قرار پایا،

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق — ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق
"حرف انی جاعل" تقدیرِ او — از زمیں تا آسماں "تفسیرِ او"

(اسرارِ خودی)

ایک نظم میں عشق کی عظمت ان الفاظ میں بیان کی ہے،

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق   معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ایک نظم میں علم و عشق کا موازنہ کرکے عشق کی عظمت و برتری دکھائی ہے۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن   عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرمِ کتابی نہ بن   عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات   علم مقامِ صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات   علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دین   عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں   عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام   شورشِ طوفان حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال عشق کا حاصل حرام   علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

(ضربِ کلیم)

یہ واضح رہے کہ علم سے ان کی مراد دنیاوی علوم ہیں جن کی بنیاد ذہنی قیاسات پر ہوتی ہے، اور ان کا مقصد ہی انسان کی محض ذہنی و دماغی تربیت ہے، ان کو قلبی وجدان سے بحث نہیں ہوتی، اس لئے ان سے ذہنی و دماغی تربیت تو ضرور ہو جاتی ہے، لیکن انسان ایمان و یقین کی لذت سے محروم رہتا ہے جس پر انسانی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے،

ایک دوسری نظم میں عقل کے مقابلہ میں عشق کی عظمت دکھائی ہے، اسکے چند اشعار یہ ہیں:

مومن از عشق است و عشق از مومن است   عشق را ناممکن ما ممکن است

عقل در پیچاک اسباب و علل   عشق چوگان باز میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند   عقل مکار است و دامے می نہد
عقل را سرمایہ از بیم و شک است   عشق را عزم و یقیں لاینفک است
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں   عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند   عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن   عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل گوید شاد شو آباد شو   عشق گوید بندہ شو آزاد شو
عشق را آرامِ جاں حریت است   ناقہ اش را سارباں حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد   عشق با عقلِ فسوں پرور چہ کرد

یعنی مومن اور عشق لازم و ملزوم ہیں، دونوں کا وجود ایک دوسرے سے وابستہ ہے، عشق کے سامنے ناممکن بھی ممکن ہے، عقل اسباب و علل کے پھیرے میں گرفتار رہتی ہے، اور عشق میدان عمل کا کھلاڑی ہے، عشق اپنے قوتِ بازو سے شکار کرتا ہے اور عقل مکار شکار کو پھنسانے کے لئے جال بچھاتی ہے، عقل کا سارا سرمایہ خوف اور شک و شبہات ہیں، اور عشق کا مایہ خمیر عزم و یقین ہے، عقل دنیا میں ہوا کی طرح ارزاں ہے، اور ہر جگہ پائی جاتی ہے لیکن عشق کمیاب اور بڑی قیمتی چیز ہے، عقل کا استحکام چون و چرا سے ہوتا ہے، اور عشق چون و چرا سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے، عقل کہتی ہے کہ اپنے کو دنیا کے سامنے پیش کرو لیکن عشق کہتا ہے کہ پہلے اپنا احتساب کرو، عقل کہتی ہے کہ دنیا میں شاد و آباد رہو، عشق کہتا ہے کہ خدا کا بندہ بن کر آزاد رہو، عشق کے لئے حریت آرام جان ہے، ان کے ناقہ کا ساربان حریت ہے، تم نے سنا نہیں کہ میدان جنگ میں عشق نے عقلِ فسوں پرور کے ساتھ کیا کیا،

اس کے بعد واقعۂ کربلا سے عقل پر عشق کی فتح دکھائی ہے،

عشق کی تکمیل اور اس میں زور و قوت محبت و اتباعِ رسول سے پیدا ہوتی ہے، جو سارے
جہان کا مالک بنا دیتی ہے،

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست | اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است | آبروے ما ز نامِ مصطفیٰ است
دل ز عشقِ اُو توانا می شود | خاک ہم دوشِ ثریا می شود
عاشقان او ز خوباں خوب تر | از حسینانِ جہاں محبوب تر
عاشقی محکم کن از تقلیدِ یار | تا کمندِ تو شود یزداں شکار
محکم از حق شو، سوے خود گام زن | لات و عزاے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق | جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق

تا خداے کعبہ بنوازد ترا

شرح اِنّی جاعِلٌ سازد ترا (اسرارِ خودی)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام مسلمان کا دل ہے، اس کی ساری آبرو اسی
پاک نام سے وابستہ ہے، مسلمان کا دل رسول اللہ کی محبت ہی سے توانا ہوتا ہے، اس سے
خاک بھی ثریا کی ہمدوش ہو جاتی ہے، رسول اللہ کے عاشق سارے دنیا کے حسینوں سے
زیادہ حسین اور سارے محبوبوں سے زیادہ محبوب ہیں، رسول اللہ کی تقلید و اتباع ہی
سے عشق میں استحکام پیدا ہوتا ہے، اور اسی سے مسلمان کی کمند یزداں شکار بنتی ہے یعنی

۱؎ عشق پر اقبال نے اتنی نظمیں کہی ہیں کہ ان پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے، ہم نے صرف بعض

خدا تک وصول کا ذریعہ صرف اتباعِ رسول ہے، اس لئے حق کے سرچشمہ سے قوت حاصل
کرو، اور ہوس کے لات و عزا کو توڑ ڈالو، عشق کی حکومت سے فوج آراستہ فاران عشق
کی چوٹی پر جلوہ گری کرو، اس وقت خدا تم کو اپنے انعامات سے نوازے گا، اور
استخلاف فی الارض کا وعدہ پورا کرے گا، یہ محض شاعری نہیں، خیر القرون کی
پوری تاریخ اس پر گواہ ہے، یہ اسلام کے عشق ہی کا کرشمہ تھا، کہ ایک اُمی قوم
نے اس دور کی تعلیم یافتہ اور متمدن ترین قوموں کا تختہ الٹ دیا،

اقبال کا مردِ مومن اور اس کے اوصاف

اقبال کے کلام میں حکیمانہ خیالات کا ایک عالم ہے، اس میں انھوں
نے قوموں اور ملتوں کی موت و حیات اور عروج و زوال کا فلسفہ
بھی بیان کیا ہے، مگر ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصلی غرض و غایت
مسلمانوں کی تجدید و اصلاح اور دینی روح کے ذریعہ اُن میں زندگی کی تاب و تواں
پیدا کرنا ہے، اس لئے انھوں نے ان کے ایک ایک مرض کی نشان دہی کی ہے، اور
اس کا علاج بتایا ہے، ان کا اصلی منصب و مقام واضح کیا ہے، اُن کے عروج و
اقبال اور نکبت و ادبار کی داستان سنائی ہے، اُس کے اسباب واضح کئے ہیں،
اور دوبارہ اس منصب و مقام اور دنیا میں عروج و اقتدار حاصل کرنے کی تدبیریں
بتائی ہیں، اور اُن کو اس تکرار کے ساتھ اور اتنے رنگا رنگ پیرایوں میں بیان کیا
ہے، کہ اگر اس کا ایک حصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی،
وہ مسلمانوں میں جو اوصاف اور جو روح پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس کو انھوں نے
مردِ حق، مردِ حُر، مردِ مومن اور قلندر کی مختلف شکلوں میں پیش کیا ہے، اس سے مردِ مومن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳۴) نظموں کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں،

کا مثالی پیکر اور ملتِ اسلامیہ کے متعلق ان کی شاعری کا لُبِ لباب نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، اس لئے زیادہ تفصیل میں پڑنے کے بجائے اس کو پیش کر دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے،

موت سے بے خوفی

زندگی خصوصًا اعلیٰ مقاصد میں کامیابی کا راز موت سے بے خوفی میں مضمر ہے، زندہ قومیں موت سے نہیں ڈرتیں، اور اپنے مقصد کی راہ میں بے تکلف جان دے دیتی ہیں، اور مردِ مومن کے لئے تو موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز، اور خدا کی راہ میں موت حیاتِ ابدی ہے۔ اس لئے ایک مومن موت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے،

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

مردِ مومن کی زندگی تسلیم و رضا کی پابند ہوتی ہے، اس کی نگاہ میں موت ایک کھیل ہے۔ بندۂ حق گویا شیر اور موت ہرن ہے، موت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے، اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، وہ موت پر اس طرح جھپٹتا ہے، جس طرح شاہین کبوتر پر جھپٹتا ہے، غلام کی زندگی موت کے ڈر سے حرام رہتی ہے، اور وہ ہر وقت اس کے خوف سے ڈرتا رہتا ہے، لیکن بندۂ آزاد کی شان جدا ہوتی ہے، اس کو موت نئی زندگی عطا کرتی ہے، وہ موت اندیش نہیں بلکہ خود اندیش ہے، اس کی موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کے بعد ہی اس کو دوسری زندگی مل جاتی ہے، جو پہلی زندگی سے زیادہ ارفع اور پائدار ہوتی ہے، اس لئے مردِ مومن قبر والی موت نہیں چاہتا،

وہ جانوروں کی موت ہے، بلکہ خدا سے وہ موت چاہتا ہے جو اس کی راہ میں جذبۂ سرفروشی کی انتہا اور رزمگاہِ شوق کی آخری تکبیر ہوتی ہے، اگرچہ ہر قسم کی موت مومن کے لئے شیریں ہے لیکن اولادِ مرتضیٰ کی موت چیز ہی دوسری ہے، دنیا کی بادشاہوں کی جنگ تو غارتگری ہے لیکن مومن کی جنگ سُنّتِ پیغمبری ہے، مومن کی جنگ، خدا کی جانب ہجرت، اور اس کے لئے ترکِ ماسوا کا نام ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو اسلام کی رہبانیت فرمایا ہے، اس نکتہ کو شہید کے علاوہ دوسرا نہیں سمجھ سکتا، جو اپنے خون سے اسکو خرید تا ہو

زندگی محکم ز تسلیم و رضا ست موت نیرنج و طلسم و سیمیا است

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

می فتد بر مرگ آں مردِ تمام مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ زندگی او را حرام از بیم مرگ

بندۂ آزاد را شانے دگر مرگ او را می دہد جانے دگر

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک

آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری ست جنگِ مومن سُنّتِ پیغمبری ست

جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت جنگ را رہبانیِ اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

مومن اپنی گفتار و کردار میں اللہ کی بُرہان ہے، وہ صفاتِ الٰہی کا پرتو ہے، اس لئے اُس کی صفاتِ قہاری، غفاری، قدوسیت اور جبروت کا مرد مومن میں ہونا ضروری ہے، اُن کے بغیر مسلمان نہیں بن سکتا، وہ اپنے مقام کی بلندی میں جبرئیل امین کا ہمسایہ ہے، وہ کسی ملک و وطن کا پابند نہیں، ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست، وہ بظاہر قرآن کا صرف قاری ہے، مگر اپنے اعمال میں قرآن کا نمونہ ہے، اس کا ارادہ قدرت کے مقاصد کا معیار ہے، یعنی اس کا ارادہ ہی قدرت کا مقصد بن جاتا ہے، اس کا عمل دنیا میں بھی دوسری قوموں کے اعمال کے پرکھنے کی میزان ہے، اور آخرت میں بھی، یعنی اس کی ذات دین و دنیا دونوں میں مردوں کے لئے نمونہ ہے، وہ صاحبِ لطف و جمال بھی ہے، اور صاحبِ جلال و جبروت بھی،

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ سمرقند

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایک دوسری نظم میں اس کی عظمت اور جمال و جلال کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے،

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

ایک نظم میں مرد مومن کی تصویر کشی اس طرح کی ہے،

ہاتھ اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ایک نظم میں مردِ حُر یعنی مرد مومن کے کمالات بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں، یہ نظم کسی قدر طویل ہے، لیکن مردِ مومن کے اوصاف کا بڑا مکمل اور موثر مرقع ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے،

مردِ حُر کی ہستی ہر قوت کی بے خوفی سے مستحکم ہوتی ہے، اسی کی قوت سے وہ میدانِ جنگ میں سربکف ہوتا ہے، وہ لا الٰہ کے نور سے روشن ضمیر ہوتا ہے، کسی سلطان و میر کا غلام نہیں ہوتا، اس کی زندگی موت سے اور پائندہ ہوتی ہے، اس کا نعرۂ تکبیر حروف اور آواز کے حدود سے ماورا ہوتا ہے، وہ راہ کے بڑے بڑے سنگِ گراں کو شیشہ کے ذروں سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ یہ درویش بے نوا قلندر سلاطین و ملوک سے خراج وصول

کرتا ہے، بڑے بڑے حریر پوش بادشاہ اس ننگے فقیر کی ہیبت سے سہمے رہتے ہیں، وہ دین کے اسرار کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے، ہم محض سُنی سُنائی باتیں جانتے ہیں، وہ اندرون خانہ کی خبر رکھتا ہے، ہم بیرونِ در رہتے ہیں، ہم کلیسا دوست اور مسجد فروش اور وہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پیمانہ نوش ہے، وہ نہ ساقی کا محتاج ہے نہ ساغر کا، ہمارا پیمانہ خالی اور وہ مست الست رہتا ہے، اس کی نمی سے پھول سُرخ رہتے ہیں، اس کا دھواں ہمارے شعلوں سے زیادہ روشن رہتا ہے، اس کے سینوں میں اقوام کی تکبیر اور اس کی پیشانی میں قوموں کی تقدیر تحریر ہوتی ہے، ہمارا قبلہ کبھی کلیسا ہے، کبھی دیر، مگر وہ دوسروں کے ہاتھ سے رزق حاصل نہیں کرتا، ہم سب فرنگ کے غلام ہیں، اور وہ خدا کا بندہ ہے، اس کی وُسعت وپہنائی کے لئے یہ جہانِ رنگ وبو تنگ ہے، اس جہانِ فانی میں اسی مردِ حُر کو ثبات ہے، اس کی موت بھی درحقیقت زندگی کا ایک مرحلہ ہے. ہمارے سارے کام ظن وتخمین سے وابستہ ہیں، وہ کم سخن مگر سراپا عمل ہے، ہم فاقہ مست اور کوچہ گرد گدا ہیں، اور اس کا فقر لا الٰہ کی قوت سے تیغ بدست ہے، ہم ایک پر کاہ کی طرح گردباد کے اسیر ہیں، اور اس کی ضرب کوہ گراں سے جوئے رواں نکالتی ہے، اس کا سینہ دیگ کی طرح جوش زن رہتا ہے، اور اس کے سامنے کوہ گراں تودہ ریگ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، صلح کی حالت میں وہ انجمن ساز اور انجمن آرا ہوتا ہے، جس طرح چمن میں باد بہاری چلتی ہے، اور جنگ کی حالت میں وہ اپنی تقدیر کا مجرم خود اپنی تلوار سے اپنی قبر کھودتا ہے،

اب اصل نظم ملاحظہ ہو،

مردِ حُر محکم ز وردِ لاتخف — ما بمیداں سر بجیب و سر بکف

مردِ حر از لا الٰہ روشن ضمیر — می نگردد بندۂ سلطان و میر

جانِ او پایندہ تر گردد ز موت — بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت

ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج — گیرد آں درویش از سلطاں خراج

پادشاہاں در قباہائے حریر — زرد رو از سہمِ آں عریاں فقیر

سرِ دیں ما را خبر آں را نظر — او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ما کلیسا دوست، ما مسجد فروش — او ز دستِ مصطفےٰ پیمانہ نوش

نے مغاں را بندہ نے ساغر بدست — ما تہی پیمانہ اُو مستِ الست

چہرۂ گل از نمِ اُو احمر است — ز آتشِ ما دودِ او روشن تر است

دارد اندر سینہ تکبیرِ امم — در جبینِ اوست تقدیرِ امم

قبلۂ ما را کلیسا گاہ دیر — او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ — او نگنجد در جہانِ رنگ و بو

در جہانِ بے ثبات او را ثبات — مرگِ او را از مقاماتِ حیات

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن — او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ما گدایان کوچہ گرد و فاقہ مست — فقرِ او از لا الٰہ تیغے بدست

ما پرِ کاہے اسیرِ گرد باد — ضربش از کوہِ گراں جُوئے کشاد

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ — پیشِ او کوہِ گراں یک تودۂ ریگ

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن — ہمچو بادِ فرودیں اندر چمن

روز کیں آں محرمِ تقدیرِ خویش — گور خود می کند داز شمشیرِ خویش

مردِ حُر کے کمالات بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو اس کی تقلید اور اس کی صحبت کی تلقین کرتے ہیں:-

شکوہ کم کن از سپہرِ گرد گرد — زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است — صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

مردِ حُر دریائے ژرف و بے کراں — آب گیر از بحر و نے از ناوداں

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر — دامنِ او گیر و بے باکانہ گیر

می نہ روید تخمِ دل از آب و گل — بے نگاہِ از خداوندانِ دل

(مسافر)

یعنی فلکِ کج رفتار کا شکوہ کم کرو، اس زندہ مرد کی صحبت سے زندگی حاصل کرو، صحبتِ علمِ کتابی سے زیادہ فائدہ مند ہے، مردانِ حُر کی صحبت انسان ساز ہوتی ہے، مردِ حر ایک دریائے بے کراں ہوتا ہے، اس لئے نالی کے بجائے اس بحرِ بیکراں سے پانی حاصل کرو، میں تمہارے قربان مجھ سے تیر کی طرح بھاگو - اور مردِ حُر کا دامن پکڑ لو۔ دل کا تخم محض آب و گل سے نہیں، کسی صاحبِ دل مردِ خدا کی نگاہِ التفات سے اُگتا ہے۔

فقر | مردِ مومن کا ایک بڑا وصف فقر بھی ہے، [illegible]ی رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے، اس سے مراد مفلسی و تنگ دستی نہیں، بلکہ حقیقی فقر، یعنی اپنی تمام [illegible] ادنیٰ خواہشات کی قربانی، دولتِ دنیا اور دنیاوی عیش و تنعم سے بے نیازی اور اس کی تحقیر، سادگی، سخت کوشی، اولوالعزمی، اور بلند نظری، توکل علی اللہ اور دنیا کی

ہر قوت سے بے خوفی کا نام ہے، ایسا فقر کسی قوت کو دھیان میں نہیں لاتا، اور بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیتا ہے، جس کی تصویر عہدِ صحابہ میں نظر آتی ہے، ایران کی فوج کشی میں جو مسلمان سفرا یزدگرد سے گفتگو کرنے کے لئے گئے تھے، ان کے گھوڑوں پر زین اور رکاب تک نہ تھی، معمولی نیزے ہاتھوں میں تھے، جسم پر قرینے کا لباس تک نہ تھا، لیکن ان کے دل فقر کی دولت سے غنی اور جوشِ جہاد سے معمور تھے، ایرانیوں نے جن کی نگاہیں ظاہری شکوہ و تجمل دیکھنے کی عادی تھیں، ان سفرا کو بڑی حقارت سے دیکھا اور تحقیر آمیز گفتگو کی لیکن جب انہی بے سروسامان اور بے نوا فقیروں کا مقابلہ ہوا تو انھوں نے ساسانی تاج و تخت کے پُرزے اُڑا دیئے، شام کی فتح کے بعد جب حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے معاہدہ کے لئے بیت المقدس کا سفر کیا، تو سواری میں معمولی گھوڑا تھا جس کے کھُر گھسے ہوئے تھے، جسم پر اتنی معمولی حیثیت کا لباس تھا، کہ خود مسلمان افسروں کو اس خیال سے شرم آتی تھی کہ عیسائی اس ہیئت میں دیکھ کر کیا اثر لیں گے، اس لئے انھوں نے ترکی گھوڑا اور عمدہ لباس پیش کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدا نے ہم کو جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی عزت ہے، اور ہمارے لئے بس ہے، مگر انہی حضرت عمرؓ نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا، اقبال نے اسی فقر کی تعلیم دی ہے، فقر پر اُن کی کئی نظمیں ہیں، یہاں ایک نظم کے کچھ اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل — یک نگاہِ راہ بین یک زندہ دل

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر — بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم ایں متاعِ مصطفےٰ است

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند | بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند
بر مقامِ دیگر اندازد ترا | از زجاج الماس می سازد ترا
برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم | مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم
بے پراں را ذوقِ پروازے دہد | پشہ را تمکینِ شہبازے دہد
با سلاطیں درفتد مردِ فقیر | از شکوہِ بوریا لرزد سریر
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک | پیشِ سلطاں نعرۂ او لا ملوک

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر | وارہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بہ آں صحرا مقام | کاندرو شاہیں گریزد از حمام
آتشِ ما سوزناک از خاکِ او | شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ او
بر نیفتد ملتے اندر نبرد | تا درو باقیست یک درویش مرد
خویشتن را اندریں آئینہ بیں | تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

حکمتِ دیں دلنوازی ہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

یعنی فقر نام ہے فراست، اور حالات پر نظر رکھنے اور گرمیِ قلب کا، فقر نانِ شعیر کی قوت سے خیبر کو فتح کرتا ہے کہ "جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری" بڑے بڑے سلاطین و فرماں روا اس فقر کے نزاک کے نخچیر ہیں، فقر نام ہے راہِ خدا میں ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا، حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس متاع کے ہم امین ہیں، فقر فرشتوں پر شبخوں مارتا ہے، اور قوانین قدرت کو مغلوب کرتا ہے، وہ ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتا اور شیشہ جیسی نازک اور معمولی چیز کو الماس جیسا

سخت اور قیمتی بنا دیتا ہے، اس کا سارا ساز و برگ قرآن حکیم سے وابستہ ہے، یہ مردِ درویش گلیم میں نہیں سماتا، بے پر و بال میں ذوقِ پرواز اور مچھر کو شہباز کی قوت عطا کرتا ہے، وہ بڑے بڑے جبروت سلاطین سے بھڑ جاتا ہے، اس کے بوریہ کے شکوہ سے تاج و تخت لرزتے ہیں، اس کے قلب کو جذب و سلوک سے قوت حاصل ہوتی ہے، وہ سلاطین و ملوک کے سامنے "لاملوک" کا نعرہ لگاتا ہے، اپنے خون سے پوری آبادی میں روح پھونک دیتا ہے، اور مخلوقِ خدا کو ظلم و جور سے نجات دلاتا ہے، وہ اسی صحرا میں رہتا ہے، جہاں شاہین کبوتر سے کتراتے ہوں، جہاں طاقتور کو کمزور کے ستانے کی جرأت نہ ہو، اس کی خاک میں اتنا سوز ہے کہ ہماری آگ اسی سے سوز و تپش حاصل کرتی ہے، اور اس کے خس و خاشاک سے شعلہ لرزتا ہے، جب تک کسی ملت میں ایسے مردِ درویش کا وجود باقی ہے، وہ کسی معرکہ میں شکست نہیں کھا سکتی، مسلمانو! اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھو یعنی اپنے میں اس مردِ درویش کے اوصاف پیدا کرو، اس وقت تم کو دنیا میں حکومت اور غلبہ حاصل ہوگا، اس قسم کی اور نظمیں بھی ہیں، مگر یہ چند مثالیں مردِ مومن، مردِ حُر، اور مردِ حق کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بالکل کافی ہیں، ان میں بہت سے اوصاف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ جس قوم میں بھی ایسے انسان پیدا ہو جائیں وہ دنیا پر حکومت اور قوموں کی امامت کریگی اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی قومیں انہی اوصاف کی بدولت دنیا پر حکمراں ہیں،

(باقی)

چند قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح

از

جناب ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن) سابق پروفیسر عربی
(پنجاب یونیورسٹی)

گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں چند سال سے اُردو زبان کے مختلف نوعیت کے الفاظ کے اشتقاق کی بحث میں مصروف ہوں، اور اس سلسلہ میں بہت سے متفرق الفاظ پر لسانی نوٹ لکھ چکا ہوں، اور ایک رسالہ کی صورت میں اپنے کام کا ایک نمونہ بھی شائع کر چکا ہوں، گذشتہ سال معارف کے اپریل اور مئی کے شماروں میں ترکی الفاظ پر جو مقالہ اس خاکسار کے قلم سے شائع ہوا تھا، وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، زیر بحث کلمات میں قرآنی الفاظ بھی شامل ہیں، اور ان الفاظ کے انتخاب میں اعلام کے علاوہ معربات اور شواذ و نوادر کو بالخصوص ترجیح دی گئی ہے، اور ان کی تشریح میں جدید لسانی تحقیقات سے مدد لی گئی ہے، بعض احباب کا تقاضا ہے، کہ میرے کام کا جو حصہ قرآنی الفاظ کے متعلق ہے، اُس کی سب سے پہلے تکمیل کی جائے، اور اسے ایک الگ مستقل لغت کی صورت میں شائع کر دیا جائے، کیونکہ ان کی رائے میں اس قسم کی لغوی تحقیق جس میں الفاظ کو اُن کے اصل اصول تک پہنچایا گیا ہے، اور ان کے ابتدائی لغوی مفہوم و معنی کو متعین کیا گیا ہے، التسلیم تفسیر کا

پہلا زینہ ہے،

پاکستان کے چند جید علما، مثلاً مشفقی و مکرمی مولانا عبد العزیز المیمنی نے میرے کام کے بعض حصوں کو دیکھا ہے، اور اس کے متعلق از راہ کرم بہت عمدہ اور حوصلہ افزا رائے کا اظہار فرمایا ہے، اس مضمون میں اسی ذخیرہ میں سے چند الفاظ کی بحث کو منتخب کر کے اور اس کی ایک تمہید لکھ کر اس کو ایک مقالہ کی صورت دے دی ہے، اور اسے ہندوستان جنت نشان کے باذوق اہلِ کمال کی خدمت گرامی میں استصواب رائے کے لئے پیش کر رہا ہوں، اور اُن سے التفاتِ خاص کی تمنا رکھتا ہوں،

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

لسانی تحقیق و تدقیق ہمیشہ سے اہلِ اسلام کی علمی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے، اور مسلمانوں میں عربوں نے بالخصوص اپنی زبان کے ساتھ جو اعتنا کیا ہے، اور لسانی تحقیقات میں جو سرگرمی دکھائی ہے، اس کی نظیر دیگر قوموں کی تاریخ میں کم ملتی ہے، اس لسانی کدوکاوش کی ابتدا قرآن مجید کے مطالعہ سے ہوئی، مسلمانوں کو اور خصوصاً عجمیوں کو جب کلام پاک کے فہم و تفہیم کی ضرورت پیش آئی، تو اس سے لسانی مسائل کی تحقیق کو تحریک ہوئی، زبان کے قواعد منضبط ہوئے، جس سے عربی کا علم صرف و نحو وجود میں آیا، از روئے انصاف اس بات کا اعتراف لازم ہے، کہ ان تحقیقات میں عرب علماء کے ساتھ ساتھ عجم کے فضلاء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، چنانچہ عربی گرامر کی سب سے پہلی جامع کتاب جو لکھی گئی، وہ ایرانی نسل کے ایک عالم سیبویہ کے قلم سے نکلی تھی، اسی طرح ترکستان کی خاک سے علامہ زمخشری جیسا عربی زبان کا عالم متبحر

پیدا ہوا،

عربی گرامر کی تدوین کے ساتھ ساتھ عربی الفاظ اور محاورات کی جمع و ترتیب بھی شروع ہوئی۔ ابتدا میں مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے، مثلاً کتاب الابل، کتاب الخیل، کتاب الشجر وغیرہ، پھر اسی مواد کو بڑی بڑی لغتوں کی صورت میں ترتیب دیا گیا، ان کتب لغت کی جامعیت اور وسعت حیرت انگیز ہے، جب لسان العرب شائع ہوئی، تو اس کی سمائی بشکل بیس جلدوں میں ہو سکی، اسی طرح قاموس کی شرح تاج العروس دس ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی، عبرانی یونانی اور لاطینی بھی علمی زبانیں ہیں، لیکن ان میں کسی زبان کو ایسے مفصل اور مبسوط لغات نصیب نہیں ہوئے تھے، عربی کتب لغت کی حیرت انگیز جامعیت اور ضخامت کی وجہ عربی زبان کی بے پایاں وسعت ہے، جس پر عبور حاصل کرنا معمولی انسان کا کام نہیں ہے، امام سیوطی نے "الاتقان" میں ایک فقیہ کا قول نقل کیا ہے، کہ کلام العرب لا یحیط بہ الا نبیؐ یعنی عربوں کی زبان اتنی وسیع ہے، کہ اس کا احاطہ نبی جیسا غیر معمولی انسان ہی کر سکتا ہے" اسی مفہوم کو امام شافعیؒ نے قدرے وضاحت کے ساتھ اپنے الرسالہ کی کتاب میں یوں ادا کیا ہے، لسان العرب اوسع الالسنۃ مذھبًا واکثرھا الفاظًا ولا نعلمہ انہ یحیط بجمیع علمہ انسان غیر نبی "یعنی عربوں کی زبان تمام زبانوں سے زیادہ وسیع ہے، اور اس کے الفاظ بھی مقابلۃً زیادہ ہیں، اور ہمیں معلوم نہیں کہ کوئی انسان سوائے ایک نبی جیسے عبقری، کے اس کے تمام علم کا احاطہ کر سکتا ہو"

عربی زبان کا ظرف بہت وسیع ہے، چنانچہ اس نے غیر زبانوں کے سینکڑوں الفاظ کو معرب کر کے یعنی اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے، اس قسم کے

متعدد معرب الفاظ قرآن مجید میں بھی آئے ہیں۔ مقالہ ہذا میں اسی قسم کے چند کلمات کی لغوی تشریح مقصود ہے۔ اور یہ تشریح اُن کی Etymology یعنی اُن کے اصول و مآخذ کی تحقیق تک محدود ہے۔[1]

اس لغوی تشریح سے پہلے اس اہم مسئلہ کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیا قرآن مجید میں عجمی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یا وہ "عربی مبین" میں نازل ہونے کی وجہ سے ایسے خارجی عناصر سے پاک ہے۔ اس مسئلہ پر علمائے اسلام دو گروہوں میں منقسم ہیں، اور اپنی اپنی رائے کے حق میں دلائل رکھتے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، عکرمہ اور مجاہد اس بات کے قائل تھے کہ قرآن پاک میں عجمی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور انھوں نے متعدد الفاظ مثلاً سجیل، مشکوٰۃ، یم، طور، استبرق اور اباریق کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ الفاظ عجمی ہیں۔ بعض دیگر مفسرین بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ کہ قرآن پاک میں عجمی الفاظ کے وجود کا اعتراف کریں، کیونکہ اُن کی رائے میں جو عجمی الفاظ معرب بن جائیں۔ یعنی عربی قالب میں

---

[1] علمائے لغت کی اصطلاح میں معرب کسی عجمی زبان کا وہ کلمہ ہے جسے عربی میں لیتے وقت حروف کی تبدیلی یا کمی بیشی سے عربی قالب میں ڈھال لیا جائے۔ اور وزن اور ہیئت کے اعتبار سے اسے عربی شکل وصورت دے دی جائے، اس قسم کے معرب الفاظ ذیل کی کتابوں میں مدون ہیں۔

(۱) کتاب المعرب من الکلام الاعجمی تالیف الشیخ ابی منصور الجوالیقی متوفی سنہ ۵۲۹ھ (مطبوعہ لائپزگ تصحیح و تحشیہ ایڈورڈ زخاؤ۔ نیز مطبوعہ قاہرہ)

(۲) شفاء الغلیل فیما فی کلام العرب من الدخیل تالیف شہاب الدین

داخل ہو جائیں، اور قریب الفہم بن جائیں، اُن کا استعمال مُخلِ فصاحت نہیں ہو سکتا،

اس کے مقابلہ میں بہت سے ائمہ مثلاً امام شافعیؒ، امام ابن جریر طبریؒ، ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ، ابنِ فارس قزوینی اور قاضی ابوبکر باقلانی قرآن مجید میں عجمی کلمات کے منکر ہیں، ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ قرآن حکیم نے بہ تکرار فرمایا ہے، کہ اُس کی زبان "عربی مبین" ہے۔ یعنی ایسی واضح زبان میں نازل ہوا ہے جس کو عرب لوگ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس رائے کے حق میں وہ اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، وَلَو جَعَلنَاهُ قُرآنًا اَعجَمِیًّا لقالوا لولا فُصِّلَت آیَاتُهُ أَ اَعجَمِیٌّ وَعَرَبِی

اس کے علاوہ خداوند کریم فرماتا ہے،

وَمَا اَرسَلنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَومِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُم،

ان کے ہم خیال علماء نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے، کہ قرآن مجید میں عجمی الفاظ کے وجود کو تسلیم کرنے سے عربی زبان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ وہ ناقص اور نامکمل اور آسمانی پیغام کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پیغام کے لئے ایسی زبان اختیار کی جو سب زبانوں سے اکمل ہے، اور ادائے مطلب کے لئے نبطی، فارسی اور سُریانی زبانوں کی محتاج نہیں۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ اگر قرآن میں غیر عربی الفاظ آئے ہیں تو اس سے یہ شبہ پیدا ہوگا کہ عربی

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) احمد الخفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ، مطبوعہ قاہرہ ۱۲۸۲ھ

(۳) امام جلال الدین سیوطی نے بھی اتقان میں غیر عربی الفاظ کو ایک مستقل فصل میں جمع کیا ہے اور اس کے علاوہ اپنی دو دیگر کتابوں یعنی المہذب اور المتوکل میں بھی معربات سے بحث کی ہے،

دیگر زبانوں کے مقابلہ میں نامکمل ہے[1]

امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کی تفسیر میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین نے بعض الفاظ کو فارسی اور بعض کو حبشی یا نبطی بتایا ہے، تو درحقیقت یہ الفاظ کا توارد اور توافق ہے یعنی عربوں، ایرانیوں اور حبشیوں نے یکساں الفاظ کو اتفاقاً استعمال کیا ہے۔ لیکن امام موصوف کی یہ توجیہ تسلی بخش نہیں ہے۔ کیونکہ بیسیوں الفاظ کے متعلق متعدد قوموں کا توارد تجربہ اور قیاس کے خلاف ہے خصوصاً جب کہ مختلف قوموں کے باہمی اتصال اور الفاظ کے انتقال کے بارہ میں تاریخی حقائق موجود ہوں،

ابو منصور الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) نے کتاب الجواہر میں اس مسئلہ کو یہ کہکر سلجھانے کی کوشش کی ہے، کہ "قرآن مجید مُبین یعنی صاف اور واضح زبان میں نازل ہوا، اور اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو عربی نہ ہو یا جسے کسی غیر زبان کی مدد کے بغیر سمجھا نہ جا سکے، قدیم عربوں کے شام اور حبشہ کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے، اور وہ ان ملکوں میں سفر کیا کرتے تھے، انھوں نے عجمی کلمات اخذ کئے، مگر ان میں چند تبدیلیاں کر دیں، مثلاً بعض حروف کو گرا دیا، اور بعض الفاظ میں جو ثقالت تھی اسے دور کر دیا، اور ان الفاظ کو اپنی شاعری اور گفتگو میں استعمال کیا، اس طرح وہ الفاظ خالص عربی الفاظ کی مانند بن گئے، اور عربی شاعری کے علاوہ قرآن پاک میں بھی استعمال ہوئے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ

[1] ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا القزوینی متوفی ۳۹۵ھ، مؤلف مقاییس اللغۃ مطبوعہ قاہرہ ۶۰ اجزاء، بحوالہ الاتقان للسیوطی، مطبوعہ قاہرہ، جلد اول ص ۳۱۵

یہ الفاظ پہلے عجمی تھے۔ لیکن جب عربوں نے اُن سے کام لیا، اور اُن کو معرب بنالیا تو وہ الفاظ اس طریق سے عربی بن گئے"۔

امام جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے بھی تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا ہے، اور اتقان میں اس بحث کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے، کہ میرے نزدیک صحیح رائے وہ ہے جس سے دونوں قولوں کی تصدیق ہوتی ہے، یہ الفاظ اپنی اصل کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن جب وہ عربوں کے استعمال میں آئے، اور انھوں نے اُن کو معرب بنالیا یعنی ان کو بدل کر اپنے الفاظ کی صورت دے دی تو وہ الفاظ عربی بن گئے، اور جب قرآن نازل ہوا تو یہ الفاظ عربوں کے کلام میں مخلوط ہو چکے تھے، اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ الفاظ اپنی موجودہ معرب صورت میں عربی ہیں تو وہ بھی سچا ہے، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، وہ بھی سچا ہے"[1]

ابو عبید، ابو منصور الجوالیقی (متوفی ۵۳۹ھ) مؤلف کتاب المعرب اور ابن الجوزی بغدادی (متوفی ۵۹۷ھ) اور دیگر علما کے اقوال بھی اسی قول کے قریب قریب ہیں،

اب ہم ناظرین کرام کی خدمت میں چند ایک ایسے قرآنی الفاظ کی لغوی تشریح پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق اکثر محققین متفق الرائے ہیں کہ وہ اپنے اصلی ماخذ کے لحاظ سے عجمی ہیں، لیکن معرب بننے کے بعد عربی زبان کا جزء لاینفک بن چکے ہیں۔ قرآن پاک نے اُن کو جس بے تکلفی سے استعمال کیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین اُن کے مفہوم و معنی سے بخوبی آگاہ تھے،

[1] الاتقان فی علوم القرآن، حصہ اول ص[illegible] مطبوعہ قاہرہ ۱۳۶۰ ہجری

لہذا اُن کا استعمال نہ تو قرآن حکیم کی فصاحت میں مخل ہوا، اور نہ اس کی زبان کے مبین ہونے میں خارج و حائل ہوا،

(۱) انجیل - از روئے قرآن مجید انجیل وہ آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالی نے حضرت عیسیٰ کو عطا فرمائی تھی، انجیل کا لفظ قرآن پاک کی چھ مختلف سورتوں میں بارہ[12] مرتبہ استعمال ہوا ہے، سورۃ المائدہ میں انجیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:-

"وَقَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ ھُدًى وَّنُوْرٌ"

ہم نے اُن (انبیاء) کے قدم بقدم عیسیٰ فرزند مریم کو بھیجا، جس نے پیش نظر تورات کی تصدیق کی، اور ہم نے اُسے انجیل دی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے"

قرآن پاک کے باقی مقامات میں بھی جہاں کہیں انجیل کا ذکر آیا ہے، اُسی طور پر ایک الہامی کتاب کی حیثیت سے آیا ہے،

لیکن جو انجیل آج کل عیسائیوں کے ہاں متداول ہے، وہ ایک انجیل نہیں بلکہ چار الگ کتابیں ہیں۔ جن میں سے ہر ایک انجیل کہلاتی ہے، اور اپنے مؤلف کی طرف منسوب ہے، ان اناجیل اربعہ کو متّی، مرقس، لوقا اور یوحنا نے (مغربی علماء کی تحقیق کے مطابق) حضرت عیسیٰ کے تقریباً ایک سو سال بعد تالیف کیا تھا، اُن میں حضرت عیسیٰ کی زندگی کے چند متفرق واقعات اور اُن کے معجزات و کرامات کا ذکر آیا ہے، اور اُن کے علاوہ اُن کی تعلیم و تلقین بھی شامل ہے، جو بعض امثال اور

وعظ و نصیحت کی صورت میں ہے، اور جس میں پہاڑی والے وعظ کو بڑی اہمیت حاصل ہے،

بعض عرب علماء نے لفظ انجیل کو عربی قرار دیا ہے۔ اور اسے مادہ "نجل" سے مشتق کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کا وزن افعیل بتایا ہے[1]۔ لیکن علامہ زمخشری نے اس قول سے اختلاف کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں، اور تکلف سے کام لے کر ان کو وری اور نجل سے مشتق بتایا اور ان کا وزن تفعلہ اور افعیل بیان کرنا اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب یہ دونوں لفظ عربی ہوں"

ابو منصور جوالیقی اور شہاب الدین احمد خفاجی نے انجیل کو معرب بتایا ہے لیکن اس لفظ کی نشاندہی نہیں کی جس کی تعریب کی گئی ہے، ابو السعادات ابن الاثیر الجزری نے النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر میں لکھا ہے کہ یہ کلمہ عبرانی ہے یا سریانی یا عربی۔ علامہ زبیدی صاحب تاج العروس نے بھی علمائے لغت کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ انجیل کو عبرانی کہتے ہیں، بعض سریانی اور بعض عربی، لیکن انہوں نے خود اس بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی، علمائے لغت کے نزدیک قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کسی غیر زبان کا لفظ ہے، جسے معرب کر لیا گیا ہے، لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا ہے، اور اس کی اصلی صورت کیا تھی،

متاخرین میں سے غیاث اللغات کے مؤلف اس سے آگاہ تھے کہ انجیل انکلیون کا معرب ہے، لیکن انہوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انکلیون آخر کس زبان

[1] کتاب المعرب للجوالیقی، طبع لائپزگ ص ۱۷،

کا لفظ ہے، اور اس کا لغوی معنی کیا ہے،

لفظ انجیل کے بارے میں مغربی علماء کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل یونانی کلمہ Euaggelion ہے جو غالباً آرامی کے توسط سے عربی میں آیا ہے اور جس کے لغوی معنی بشارت ہیں، مروجہ اناجیل کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے پیغام کو آسمانی بشارت کہتے تھے۔ جسے انہوں نے جلیل اور فلسطین کے دیگر شہروں اور قریوں میں چل پھر کر سنایا اور اپنے حواریوں سے بھی کہا کہ جاؤ اور لوگوں کو خوشخبری دو کہ آسمانی بادشاہت کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ لوقا کی انجیل (باب چہارم) میں ہے کہ ایک دن حضرت عیسیٰؑ شہر ناصرہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ میں گئے، اور اشعیاء نبی کی کتاب کھول کر یہ عبارت پڑھی کہ "خدا کی روح مجھ پر غالب ہے کیونکہ اس نے مجھ کو مسح کیا ہے تاکہ میں مسکینوں کو یہ بشارت سناؤں کہ اس نے مجھے اس بھیجا ہے کہ میں دل شکستہ لوگوں کو شفا دوں، اسیروں کی آزادی کی منادی کروں جو اندھے ہیں اُن کو بینائی دوں، اور جو مظلوم ہیں، اُن کو آزاد کروں" چونکہ حضرت مسیح نے اپنی تعلیم اور اپنے پیغام کو بشارت سے تعبیر کیا تھا، اس لئے وہ کتاب بھی جس میں اُن کی سیرت اور تعلیم مدون ہوئی، انجیل یعنی بشارت کہلائی،

اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے ہم وطنوں کی زبان آرامی تھی، پھر اُن کے پیغام کے لئے ایک یونانی کلمہ کیوں استعمال ہوا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے زمانے میں فلسطین اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ملکوں میں اسکندر اعظم کی فتوحات کے بعد کئی صدیوں سے یونانی علمی زبان کی حیثیت سے رائج چلی آرہی تھی، اگرچہ قدیم یونانی قوم کی حکومت پر زوال آچکا تھا، لیکن ان کے

علوم کا سکہ ابھی تک جاری تھا۔ اور اُن کی زبان کا علمی تسلط بہت سے ملکوں پر ہنوز قائم تھا، اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے مقلدوں اور مبلغوں نے اپنے دین کی اشاعت کے لئے اسی عالمگیر علمی زبان سے کام لیا، چنانچہ اناجیل اربعہ یونانی زبان ہی میں قلمبند ہوئیں، اور چونکہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیغام کو بار بار بشارت کہا تھا، اس لئے وہ انجیل کے نام سے موسوم ہوئیں، جس کے معنی خوشخبری کے ہیں،

انگریزی زبان میں انجیل کے لئے گوسپل (Gospel) کا جو لفظ مستعمل ہے اس کے معنی بھی بشارت ہیں، گاسپل گویا "انجیل" کا لفظی ترجمہ ہے،

انگریزی لفظ (Evangel) بھی مذکورۂ بالا یونانی کلمہ سے ماخوذ ہے، چنانچہ اناجیل اربعہ کے مؤلفین Four Evangelists کہلاتے ہیں؛

(۲) بعل: بعل سامی زبانوں کا ایک عام اور مشترک لفظ ہے جس کے لغوی معنی رب، مالک، خداوند یا آقا کے ہیں،

جلال الدین سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ ملک یمن اور قبیلہ ازد کی زبان میں بعل کے معنی رب کے ہیں، اور جنوبی عرب میں گلازر (Glaser) نے حمیری زبان کے جو کتبات دریافت کئے تھے، اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیونکہ ان میں بھی بعل کا لفظ مالک یا حاکم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے،

کنعانی لوگ بالخصوص بعل کے لفظ کو اپنے خداوند کے لئے استعمال کرتے تھے اور یہ وہ قوم ہے جو بلادِ عرب سے نکل کر عبرانیوں سے بھی پہلے ملک شام میں آباد ہو چکی تھی، اور جسے یونانیوں نے فنیقی (Phoenicians) کہا ہے، اسی

قوم نے صور و صیدا سے نکل کر افریقہ کے شمالی ساحل پر قرطاجنہ (کارتھیج) کا شہر آباد کیا تھا۔ چنانچہ قرطاجنہ کے کتبوں میں بھی بعل کا لفظ بکثرت ملتا ہے،

بعل کا لفظ، بصیغہ مفرد و جمع، تورات میں بھی کئی جگہ آیا ہے، اور اس سے عبرانیوں کے مخالف قبیلوں اور قوموں (مثلاً کنعانیوں) کے معبود مراد ہیں،

بعل کا لفظ ذیل کے مرکبات کا ایک جزء ہے،

بَعلَبَكّ :- شام کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے، جو اب ویران ہو چکا ہے، اس کے معنی غالباً "بعل کا شہر" ہے۔ یونانیوں نے اُسے Heliopolis (یعنی مدینۃ الشمس) کہا ہے، کیونکہ وہاں سورج دیوتا کی پوجا ہوتی تھی،

ہنی بعل Hanni bal قرطاجنہ والوں کا ایک مشہور سپہ سالار تھا جس نے مدت دراز تک اپنے حریف رومیوں کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور شہرت دوام پائی۔ لفظی معنوں کے لحاظ سے ہنی بعل وہ شخص ہے جس کو بعل نے برکت دی ہو،

عربوں کے ہاں بھی ایک نام ہُنَیّ آیا ہے۔ میرے خیال میں اس کا مفہوم بھی ہنی بعل کے مفہوم سے بہت قریب ہے۔

بعل کے اصلی معنی تو مالک یا معبود ہیں، لیکن عربی میں مجازی طور پر شوہر کو بھی بعل کہہ دیتے ہیں، قرآن مجید میں بعل کا لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے، سورۂ الصّٰفّٰت میں ہے:-

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ،	کیا تم (اپنے دیوتا) بعل کو پکارتے ہو۔ اور بہترین پیدا کرنے والے کو چھوڑ رہے ہو،

سورۂ ہود میں بعل کا لفظ اس کے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے

قَالَتْ یٰوَیْلَتیٰٓ ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ط اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ٥	اس نے (یعنی ابراہیمؑ کی زوجہ نے) کہا کہ ہائے افسوس کیا میں جنوں گی، حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور میرا شوہر بھی بوڑھا ہے، بیشک یہ ایک عجیب بات ہے،

بعل کی جمع بُعُوْلَہ ہے جو اسی مجازی معنی میں دیگر تین سورتوں میں چار[۴] مرتبہ استعمال ہوئی ہے،

ڈاکٹر ہورووِٹس (Horovitz) نے اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعل کا لفظ عربوں نے شاید حبشی زبان سے اخذ کیا ہو، لیکن اس رائے کی تردید اس سے ہوتی ہے کہ بعل کا لفظ دیار عرب کے اس قدیم دور کے کتبوں میں پایا گیا ہے جب اہل حبشہ جنوبی عرب میں وارد بھی نہیں ہوئے تھے۔ یا اُن کتبوں کے علاقوں میں ان کی کبھی رسائی نہیں ہوئی،

اسی طرح پروفیسر جیفری نے لکھا ہے کہ عربوں نے بعل کا لفظ غالبًا سُریانی زبان سے لیا ہے، لیکن واقعات سے اس رائے کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ سریانی زبان عربی کے مقابلہ میں حدیث العہد ہے۔ اور اس زبان کا لٹریچر بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش

کے بعد وجود میں آیا، حالانکہ بعل کا لفظ بلاد عرب کے ایسے کتبات میں پایا گیا ہے، جو حضرت عیسیٰؑ کے عہد سے قدیم ترین۔ اسی لئے پروفیسر نولڈکے اور پروفیسر ولہازن نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جہاں تک بلاد عرب کا تعلق ہے بَعْل کا لفظ مقامی اور ملکی ہے یعنی ٹھیٹھ عربی ہے،

۲- جبریل یہ نام عبرانی ہے، جو جبر اور ایل سے مرکب ہے۔ جبر بمعنے جبروت یعنی قوت وطاقت اور ایل بمعنے اِللہ۔ لہٰذا جبریل کے معنی ہوئے قدرت اللہ یا قدرتِ خدا،

جبریل کا لفظ تورات (Pentateuch) میں نہیں آیا، لیکن صحیفۂ دانیال میں ہے، دانیال ایک رویا کا ذکر تا ہے کہ ایک غیبی آواز سنی جو جبریل کو مخاطب کر کے کہتی تھی کہ دانیال کو اس رویا کی تعبیر بتا دے"؛ (دانیال $\frac{8}{16}$)

متی کی انجیل (باب اول) میں بھی جبریل کا ذکر ہے، جبریل حضرت زکریاؑ کو یحییٰؑ کی پیدائش اور حضرت مریمؑ کو عیسیٰؑ کی ولادت کی بشارت دیتا ہے

قرآن مجید میں جبریل کا صرف دو تین مرتبہ ذکر ہے، سورۂ بقرہ میں جبریل کا ذکر یوں آیا ہے :-

"قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ٥ (البقرہ - ۱۱)

پھر سورۃ التحریم میں ہے:۔

"اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ

ظَهِيْرٌ" (تحریم - ۱)

(۴) جزیہ :۔ جزیہ وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت ذمیوں یعنی اپنی غیر مسلم رعایا پر اُن کے جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں عاید کرتی تھی،

جزیہ کا لفظ قرآن مجید (سورۃ براءت) میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے:۔

"قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	اُن لوگوں سے جنگ کرو جو نہ اللہ
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ یوم
وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ	آخرت پر، اور نہ اُس چیز کو حرام
وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ	سمجھتے ہیں جس کو اللہ اور اُس کے
الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا	رسُول نے حرام قرار دیا ہے، اور
الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ	نہ وہ دین حق کی پیروی کرتے
عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ	ہیں، ان لوگوں میں سے جن کو
	کتاب دی گئی ہے، یہاں تک
(توبہ - ۴)	کہ وہ مطیع ہو کر جزیہ دیں،

امام راغب اصفہانی نے مفردات فی غریب القرآن میں جزیہ کو جزی سے مشتق بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ اسے جزیہ اس لئے کہتے تھے کہ وہ ذمیوں پر اُن کے مال و جان کی حفاظت کے "بدلے" میں عاید کیا جاتا تھا۔ لسان العرب کا بیان بھی

اسی کے قریب قریب ہے، جوالیقی اور خفاجی نے بھی جزیہ کو معربات میں شمار نہیں کیا، غرض کہ جزیہ اُن کے نزدیک ایک خالص عربی لفظ ہے،

لیکن اس کے برعکس ابو عبداللہ محمد بن احمد خوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے اپنی تالیف "مفاتیح العلوم" (مطبوعہ لائڈن ۱۸۹۵ء) میں جزیہ کے متعلق لکھا ہے:۔

هُوَ مُعَرَّبُ گزیت وَهُوَ	یعنی جزیہ اگزیت کا معرب ہے،
الخَرَاجُ بالفارسية،	اور فارسی میں اس کے معنی خراج کے ہیں،

علامہ شبلی نعمانی نے اسی قول کو قبول کیا ہے، اور اس کی تائید میں متعدد فارسی لغت نگاروں کی تصریحات کو بطور سند پیش کیا ہے، مفصل بحث کے لئے ملاحظہ ہو ممدوح کا رسالہ "الجزیۃ" جو "رسائل شبلی" کے علاوہ اُن کے مجموعۂ مقالات میں بھی دوبارہ طبع ہو چکا ہے،

۵۔ جُناح جناح کا لفظ قرآن مجید میں گناہ کے معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے اور مختلف سورتوں میں پچیس مرتبہ آیا ہے، اور لاجناح علی کی ترکیب بہت عام ہے،

عربی لغت نویسوں نے جناح کو ٹھیٹھ عربی لفظ قرار دیا ہے، اس لئے اس کے اصل ماخذ کے متعلق بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی، بعض نے صرف اس بات پر اکتفا کی ہے، جُناح جُنوح سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں،

عربی لفظ جُناح اور فارسی گناہ کے درمیان جو واضح اور حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے، اس کی بنا پر یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کا باہمی تعلق اور اُن کی مشابہت کی نوعیت کیا ہے، کیا یہ مشابہت محض اتفاقی ہے یا فی الواقع اس لفظ کو ایک زبان نے دوسری زبان سے مستعار لیا ہے، اگر مستعار لیا ہے،

تو کیا یہ لفظ عربی سے فارسی میں آیا ہے۔ یا فارسی سے عربی میں دخیل ہوا ہے،

اس سوال کے جواب میں جرمن مستشرق ہبس مَن (Hubschmann)

نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جُناح دراصل فارسی لفظ گناہ ہے، جسے معرّب کرلیا

گیا ہے[1] اس قول کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ قرآن مجید میں اس قسم کے متعدد الفاظ

ہیں مثلاً ابریق، سجیل، زمہریر اور فردوس جو قطعی طور پر فارسی الاصل ہیں فارسی الفاظ کی تعریب عربوں

کا معمول رہا ہے، اس لئے اگر جُناح کی اصل فارسی ہے تو یہ کوئی خلاف معمول یا بعید از

قیاس امر نہیں ہے۔ (باقی)

---

[1] Hubschmann, Persische studien P.162, 1895 A.D.

مقالاتِ سلیمان جلد سوم

یعنی مولانا سید سلیمان ندوی کے مذہبی و قرآنی مقالات کا مجموعہ قیمت ۹ — ۲۵

ایک منزل کئی قافلے

جناب یعقوب سروش کے سفرِ حج کی اثر انگیز روداد، جسے پڑھ کر اسلام کی اس عظیم عبادت

کی بے مثال اجتماعیت کی پوری تصویر چشم تصور کے سامنے آجاتی ہے، پڑھنے والا خود کو مرکزِ اسلام

کے در و بام کے قریب دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ محسوس کرتا ہے،

دلکش زبان۔ تاثر انگیز انداز بیان۔ اخلاص و عجز، اور خود سپردگی و خاکساری

کی کیفیات سے بھرپور،

قیمت: دو روپے پچاس پیسے۔ ۱۰ نسخے منگوانے پر کمیشن ۲۵ فیصد،

منیجر

مکتبہ دوام۔ ٹانڈہ (فیض آباد) یو۔پی

سیاست میں اسلام

افغانستان

ترجمہ حافظ محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین

انگریزی کے مشہور سہ ماہی رسالہ "دی مسلم ورلڈ" نے چند سال قبل "سیاست میں اسلام" کے عنوان سے

ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا، اور اس پر مختلف ماہرین سے مضمون لکھوائے گئے تھے بعد میں ان تمام مضامین

کو رسالہ کے ایک خاص نمبر میں شائع کردیا۔ ان سے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے مذہبی و

سیاسی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے، اسلئے معارف میں ان کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

افغانستان کی مجموعی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے جس میں کئی قومیں مختلف

رنگ کے طبعی حالات اور متعدد زبانیں پائی جاتی ہیں، وہاں کا سب سے زیادہ نمایاں

فرقہ پختونوں کا ہے، اور سرکاری زبان پشتو ہے، مسلمان ۹۹ فی صد ہیں، جن میں

۸۰ فی صد حنفی المسلک ہیں، باقی میں قابلِ ذکر اسماعیلیوں کا ایک چھوٹا سا فرقہ اور

اثنا عشری اامیوں کا فرقہ ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ افغانستان کے دیہاتوں،

جرگوں اور اکثر شہری علاقوں میں اسلام جس شکل و صورت میں موجود ہے۔ اس کی

شناخت ایک مسلمان عالم کے لئے نہایت مشکل ہے۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح

افغانستان میں بھی اسلام کی دو شکلیں نظر آتی ہیں، ایک تو وہ جو خواندہ اور روشن

طبقہ میں رائج ہے، اور دوسری وہ جس پر ناخواندہ لوگ عمل کرتے ہیں: افغانی

سوسائٹی میں کئی عقائد ایسے ہیں جو اسلامی تعلیمات کی ضد قرار دیئے جا سکتے ہیں مثلاً

"پختون ولی" یا پہاڑی علاقوں کا روایتی اصول "خون کا بدلہ خون" وغیرہ،

افغانستان کے دیہاتوں میں پیروں، جادو، ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ بہت رائج ہیں، ہر مشکل اور مصیبت کے موقع پر ان سے مدد لیجاتی ہے، یہاں کے ناخواندہ اسلام کو ایک آزاد اصول زندگی کی حیثیت سے نہیں مانتے، بلکہ اسے ایک نادیدہ شئے قسمت کے ہاتھوں بے بسی، اور بے چون وچرا تسلیم برضائے الٰہی کا نمونہ سمجھتے ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان نظریات کا سیاست پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے، خاص کر ایک ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت ناخواندہ ہے، افغانستان میں زیادہ تر دیہاتی یا جاہل کسان ہیں، جو ملاگیری کے ذریعہ اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں۔

موجودہ تاریخی تبدیلیاں

افغانستان میں قومیت کا جنم ۱۸۸۰ء میں ہوا، جب عبدالرحمٰن خان امیر کابل ہوئے، انھوں نے تمام اوقاف پر قبضہ کرکے ان کے متولیوں کا حکومت کی جانب سے وثیقہ جاری کردیا، یہ بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن خاں ایک ظالم سوسائٹی کے جابر ترین فرد تھے۔ وہ مذہبی قائدین کی مخالفت قطعی برداشت نہیں کرسکتے تھے، اُن کے بعد اُن کے ولی عہد بیٹے امیر حبیب اللہ کے دور حکومت (۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۹ء) میں مذہبی رہنماؤں کو پھر فروغ حاصل ہوا اور امیر حبیب اللہ نے اوقاف اُن کے متولیوں کو واپس کردیئے۔ امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد اُن کے تیسرے بیٹے امان اللہ خان تخت وتاج کے وارث ہوئے، انھوں نے دس سال (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۹ء) تک افغانستان کو بڑے خلفشار میں مبتلا رکھا، امان اللہ خان، افغانستان کو جدید رنگ دینا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے نہ تو عوام پر اُن کو مکمل قابو حاصل تھا، اور نہ فوج زیادہ مضبوط تھی، اور اپنی ترقی پسندانہ اسکیموں کو چلانے کے لئے انھوں نے فوج میں تخفیف بھی کردی تھی، انھوں نے اپنے آئین اور فرامین کے ذریعہ افغانی زندگی

کو کافی حد تک سیکولر بنانے کی کوشش کی، پردہ کا رواج ختم کیا، مخلوط تعلیم کے سیکولر اسکول قائم کئے، کابل کے لوگوں کو مغربی لباس پہننے کا پابند بنایا، سب سے بڑھ کر یہ کہ روس کی ٹیکنیکی امداد قبول کرلی، عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ افغانستان کو روسی امداد ۱۹۵۰ء کے بعد ملنا شروع ہوئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد وہ دوبارہ جاری ہوئی تھی،

بہرحال افغانستان کا مذہبی طبقہ اور قدامت پرست گروہ اپنی آزادروی پر ان غاصبانہ کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا، جس سے بالآخر افغانستان میں بغاوت ہوگئی، اس بغاوت کے پس پشت نہ تو فوج تھی، اور نہ عوام کی اکثریت صرف وہ قبیلے تھے جن کو قدامت پرست مذہبی رہنماؤں اور انگریزوں کے تربیت یافتہ دیوبندی علماء نے بھڑکایا تھا۔ اس لئے امان اللہ خاں اپنی ترقی پسندی کا آپ شکار ہوگئے، افغانی علماء کے خیال میں امان اللہ خاں کی پالیسی غیر اسلامی تھی، اس لئے خدا نے اپنی پشت پناہی ان سے چھین لی جس کی بل پر وہ حکومت کر رہے تھے،

اس کے بعد ۹ مہینے تک ایک تاجک ہیرو بچہ سقہ جو اپنے کو حبیب اللہ غازی کہتا تھا۔ افغانستان پر حکومت کرتا رہا۔ ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کے ایک دور کے چچا زاد بھائی جنرل محمد نادر خاں (جن کو امان اللہ خان کی ترقی پسندی کی مخالفت کے باعث ملک بدر کردیا گیا تھا) نے اس غیر پختونی غاصب کو تخت سے اتار دیا اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک خود شاہ محمد نادر شاہ کے نام سے حکومت کرتے رہے، ۱۹۳۳ء میں وہ قتل کردیئے گئے۔

قتل سے پہلے ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ایک دستور جاری کیا تھا، جو ترکی،

ایران، اور فرانس کے دستوروں کا مرکب تھا، مگر افغانیوں نے اس کو کبھی مکمل طور سے نافذ نہ ہونے دیا۔ اور مذہبی رہنما اپنی قدامت پسندی کے باعث سیکولر نظریات کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے

ان کی وفات کے بعد ان کے تین پسماندہ بھائیوں (محمد ہاشم، شاہ محمود اور شاہ ولی) نے انیس سالہ ولی عہد شہزادے کی پشت پناہی کی، جو افغانی تاریخ میں نیا واقعہ تھا، کیونکہ افغانستان اور مشرق وسطیٰ کے دیگر مسلم ممالک میں حکمراں کی موت کے بعد اس کے بھائیوں اور بیٹوں وغیرہ میں ہمیشہ تخت کے لئے جنگ ہوتی آئی ہے، محمد ہاشم ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء تک اور شاہ محمود ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک اس وقت تک شاہزادے کے سرپرست رہے، جب تک وہ پختہ کار نہ ہوگیا، مسلم معاشرہ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ باپ کی موت کے بعد چچا ولی، اور نگران ہوتا ہے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک افغانستان میں پارلیمانی طرز حکومت کے لئے ہلکی پھلکی کوششیں ہوتی رہیں، لیکن افغانستان اپنی قدامت پرستی پر قائم رہا۔ ترقی کی رفتار بہت سُست رہی، اور مذہبی رہنماؤں کی طاقت میں کوئی کمی نہ ہوئی،

جدیدیت کی طرف نئے قدم ۱۹۵۳ء میں افغانستان کے حالات نے ایک نئی کروٹ لی، جنرل محمد داؤد خاں نے جو بادشاہ اور وزیر دفاع کا چچازاد بھائی تھا، اپنے چچا شاہ محمود سے خون خرابہ کئے بغیر اقتدار چھین لیا، اور وزیر اعظم کی حیثیت سے مشرقی اور مغربی ممالک سے بیش از بیش امداد حاصل کرنا شروع کر دی، اور ۱۹۶۳ء میں جب وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہوا، تو افغانستان کو ایسے معاشی، اقتصادی اور سماجی خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں صحیح آئینی حکومت کا قیام عمل میں آیا،

وزیر اعظم داؤد نے اپنے دس سالہ دورِ حکومت میں بڑے بڑے مذہبی ملاؤں سے کئی بار ٹکر لی، اور ہر بار کامیاب رہا، کیونکہ اس کا زیادہ تر انحصار فوجی طاقت پر تھا، قدامت پرست علماء ہر موڑ پر اس کی مخالفت کرتے رہے، انھوں نے نظام تعلیم کو سیکولر بنانے اور بہت سی قانونی و سیاسی اصلاحات کی شدید مخالفت کی ۱۹۵۹ء میں پردہ کا رواج ختم کر دینے پر دینی رہنما نہایت برہم ہوئے، لیکن داؤد نے اپنے مخالف تقریباً پچاس سرغنہ لوگوں کو جو اس اقدام کو غیر اسلامی تصور کرتے تھے، بلا تامل جیل میں ڈال دیا۔ ان ملاؤں پر غداری اور کفر کا الزام لگایا گیا، افغانستان کے نوجوان وکلاء، نیز الازھر اور کولمبیا اسکول کے فارغین نے بھی حکومت کے موقف کو حق بجانب ثابت کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ پردہ بازنطین اور ساسانی دور کا ایک شہری رواج تھا، جو مسلمان فاتحین نے اختیار کر لیا تھا" ان توضیحات اور بحثوں نے ملاؤں کو پردہ کی تنسیخ قبول کرنے پر مجبور کر دیا، مگر اکثر وبیشتر دل سے اس کے لئے رضا مند نہیں ہو سکے ہیں انا خوانندہ لوگوں کے مذہبی عقائد کو دلائل سے بدلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے،

داؤد نے ۱۹۵۹ء میں جدیدیت کی مخالفت کی تحریک کو فوجی طاقت سے کچلنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا، اور مالگزاری نہ دینے والوں اور قندھار کے مذہبی فسادات میں حصہ لینے والوں کی بھی سرکوبی کی، اس سے قدامت پرست طبقہ بے اثر ہو کر رہ گیا،

وزیر اعظم داؤد کا زوال پختونستان کی تحریک کی حمایت کی وجہ سے ہوا، اس مسئلہ کی وجہ سے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۳ء تک افغانستان پاکستان سرحد بند رہی، اور وہ دوبارہ اسی وقت کھل سکی، جب محمد ظاہر شاہ نے داؤد کو آزاد پختونستان کی حمایت کے باعث استعفا دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد شاہ نے ایک عارضی وزارت کی تشکیل کی، جس کے سربراہ

ڈاکٹر محمد یوسف سابق وزیر معدنیات وصنعت تھے، نئے وزیراعظم کو شاہ نے ایک ایسا آئین تیار کرنے کی ہدایت کی جو آئینی بادشاہت کے لئے فضا ہموار کرسکے، اس طرح کا آئین شاہ محمود اور داؤد خاں کے زیر غور بھی تھا، اور اب وہ وقت آچکا تھا جب شاہ کو اپنے اختیارات کا کچھ حصہ عوام کو منتقل کرنا ضروری ہوگیا تھا، نیا آئین یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کو نافذ کیا گیا، اس میں اسلام کو جدیدیت کے لئے ایک حربہ اور آلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا،

اس آئین کے بانی وہ نوجوان تھے جنھوں نے افغانستان کی بہترین مذہبی درسگاہوں یا الازہر اور مغربی لا اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی، لویا جرگا" (قومی آئین ساز اسمبلی) کے قدامت پرست لوگوں کے ہر اعتراض کو ان تربیت یافتہ افغانی وکلاء و علماء نے بے اثر بنادیا، اور متشدد قسم کے قدامت پسندوں کو شاہ نے خود بھسلانے کی کوشش کی کچھ لوگ مخالفت سے باز بھی آگئے، پھر بھی بڑا طبقہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

ذیل میں ہم اس آئین کے بعض ان حصوں کا جائزہ لیتے ہیں، جن کا اسلام سے براہ راست تعلق ہے، آئین کی دفعہ (۱) و (۲) بتلاتی ہے کہ افغانستان ایک آئینی بادشاہت ہے، ایک آزاد اور غیر منقسم ملک ہے اور اسلام حکومت کا سرکاری مذہب ہے۔ ۱۹۳۱ء کا آئین حنفی اصولوں کو ملک کا مذہب بنانے پر مبنی تھا، اس میں شیعوں اور غیر حنفی سنیوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، لیکن ۱۹۶۴ء کا آئین صرف حنفی مذہب کی روشنی میں حکومت کو عمل درآمد کرنے کا پابند بناتا ہے، اس میں غیر مسلموں کو بھی اس حد تک مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے، جس سے امن عامہ یا حکومت کا قانون متاثر نہ ہو، دفعہ (۷) اور (۸) بادشاہ کو اسلام کے مقدس اصولوں کا محافظ مقرر کرتی ہے،

اس کے لئے ضروری ہے، کہ وہ قوماً افغان، مذہباً مسلمان اور مسلکاً حنفی ہو، ایسا اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی بقا کے لئے شاہی خاندان میں ہی حکومت کا سلسلہ چلتا رہے، آئین کی دفعہ (۲۴) شاہی خاندان کے افراد کو سیاسی پارٹیوں کا ممبر بننے، وزارتی یا عدالتی عہدہ سنبھالنے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے سے باز رکھتی ہے، یہ چیز اگرچہ افغانی حکومت کو سیکولر بناتی ہے لیکن اس سے ملک کا اصل اقتدار بادشاہ کے ہی ہاتھوں میں رہتا ہے، جیسا کہ آئین کی دفعہ (۴۳) میں بصراحت مذکور ہے کہ:-

"بادشاہ اپنے حکم خاص کے ذریعہ پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کو ختم بھی بھی کرسکتا ہے"،

آئین کے چند دوسرے اہم نکات یہ ہیں، سماجی انصاف، قانون کی نظر میں مساوات، شخصی آزادی، ذاتی جائداد کا تحفظ، عقیدہ و تقریر کی آزادی، تعلیم کا حق صحت کے لئے سہولتیں فراہم ہونا اور سیاسی پارٹیاں بنانے کے حقوق۔ یہ تمام چیزیں اسلام کی روح کے عین مطابق ہیں،

آئین کی سب سے اہم دفعات (۶۹) اور (۱۰۲) ہیں، دفعہ (۶۹) کے مطابق "اس آئین میں درج تفصیلات کے علاوہ وہ تجاویز بھی قانون کا درجہ رکھتی ہیں، جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے پاس کیا ہو، اور جسے شاہ کی منظوری حاصل ہو، ان خطوں میں جہاں اس طرح کا کوئی قانون نہ نافذ ہوا ہو، حنفی اصولوں ہی کو قانون تسلیم کیا جائے گا"۔ دفعہ (۱۰۲) کی تفصیل یہ ہے کہ

"عدالتیں اپنے زیر سماعت مقدمات میں آئین اور حکومت کے قوانین کا استعمال کریں گی لیکن اگر زیر سماعت مقدمہ آئین یا قانون کے حدود میں نہ آتا ہو تو حنفی قانون

کی رو سے آئین کے حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے گا، تاکہ زیادہ سے انصاف مل سکے"۔

یہ دونوں دفعات افغانستان کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ سیکولر قومیت کا رنگ دیتی ہے، دفعہ (۶۹) کا تعلق مقننہ سے ہے، اور دفعہ (۱۰۲) کا عدلیہ سے ہے، یہاں سیکولر قوانین کو مذہبی اصولوں پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے، اور اب تو افغانی پارلیمنٹ ۱۳۲ ایسے قوانین بنا رہی ہے، جو سیکولر عدالتوں میں مذہبی اصولوں کی جگہ لے لیں گے، ان قوانین کا تعلق انتخابات، پریس، سیاسی جماعتوں، سرمایہ کاری آمدنی اور ٹیکس، تعلیم، صوبائی و میونسپل حکومت، ولسی جرگہ (ایوان زیریں) کے اندرونی نظام، تعزیری اقدامات اور شادی و وراثت سے ہے،

ان کی تکمیل تو مستقبل میں ہو گی، لیکن آئین افغانستان نے قومیت کا ایک تصورات ضرور قائم کر دیا، پھر بھی یہ تلخ حقیقت ہمیں کسی وقت فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ پچانوے فی صد ناخواندگی اور قدامت پرست قبائل کے کسان عوام مستقبل قریب میں ان کو [illegible] کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے،

انتخابات، فسادات اور اخبارات

افغانستان کا پہلا آزادانہ انتخاب اگست ستمبر ۱۹۶۵ء میں بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوا، اس میں تعلیم کی کوئی قید نہ تھی، انتخابات کے لئے خفیہ ووٹ کا طریقہ اختیار کیا گیا، لیکن ووٹ دینے والوں کی فیصد تعداد بہت کم رہی ہے، اگرچہ عورتوں کو بھی الکشن میں کھڑے ہونے کا حق حاصل تھا لیکن کسی خاتون امیدوار نے گاؤں سے پرچہ نامزدگی داخل نہیں کیا، البتہ کابل سے تین عورتیں ایوان زیریں کے لئے منتخب ہوئیں، اس وقت افغانستان کی وزارت میں وزارت صحت عامہ ایک عورت

کے ہاتھ میں ہے، ایوانِ زیرین کے تمام ممبر عوام کے منتخب کردہ ہوتے ہیں، ......

...... ایوانِ بالا (مشرانو جرگہ) کے ایک تہائی ممبر منتخب کئے جاتے ہیں، ایک تہائی صوبائی کونسلوں کے منتخب کردہ ہوتے ہیں، ......

...... اور ایک تہائی بادشاہ نامزد کرتا ہے لیکن قانون سازی کا اصل اختیار ایوانِ زیریں کے ہاتھ ہے، ان دونوں ایوانوں میں علماء بھی بیٹھتے ہیں، اور ایوانِ زیریں کا سکرٹری ایک ممتاز مذہبی لیکن جدید نظریات کا حامل شخص ہوتا ہے، موجودہ افغانی پارلیمنٹ سیاسی میدان کی وسعت کا بہترین نمونہ ہے، روایت پسند، ترقی پسند علماء سیکولر نظریات رکھنے والے دائیں اور بازو کے ممبران سب بحث میں حصہ لیتے ہیں، مگر پاس شدہ تجاویز پر جدیدیت (Moderniom) کا رنگ غالب رہتا ہے، لیکن روایت پسندوں کی طاقت بھی کچھ کم نہیں، اور پارلیمنٹری نظام کے تحت اُن کی تنظیم اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئی ہے، اور یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ سیکولر نظریات کی ابتداء نے مذہبی طبقہ کو سیاسی طور پر منظم ہونے کا موقع فراہم کیا ہے، جیسا کہ کئی حالیہ واقعات سے ظاہر ہے، مثلاً مئی ۱۹۶۶ء میں ایوان زیریں نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے طالبات کو قومی لباس پہننا ضروری اور برقع ممنوع قرار دیا گیا تھا، لیکن سر پر رومال باندھنا لازمی تھا، ایوان کی خاتون ممبران کو اس کے خلاف بولنے کی جرأت تو نہ ہو سکی لیکن اُن میں سے ایک رونے لگی،

۷، ار جولائی ۱۹۶۵ء کا پریس قانون اب بھی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، جدیدیت کے علمبردار اس کو زیادہ نرم بنائے کے حامی ہیں، اور قدامت پرست اور سخت کرنا چاہتے ہیں، اس قانون کی رو سے عوام کو اخبارات نکالنے کی مکمل آزادی ہے، اب بائیں بازو کا ایک

ہفت روزہ اخبار "خلق" ایرانی کمیونسٹ پارٹی (جواب غیر قانونی قرار دی جاچکی ہے) "تودہ" کی حمایت کرتا ہے، مئی ۱۹۶۶ء میں ایوان بالا کے بعض قدامت پرست اور مذہبی رہنماؤں نے اخبار مذکور کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کیا، ایوان زیریں نے بھی ۲۲ مئی کو اسی قسم کی ایک تجویز منظور کی، پریس قانون واضح طور سے بتلاتا ہے کہ "اخبارات کو اسلام کے اصولوں آئینی شہنشاہیت اور آئین کے دوسرے پہلوؤں کا تحفظ کرنا چاہیئے" خلق کے اڈیٹر اور پبلشر نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا کہ "یہ اخبار اسلام کا مخالف نہیں ہے، اور موجودہ حالات کے تحت وہ آئینی شہنشاہیت کی تائید کرتا ہے"

اس بیان نے قدامت پرستوں کو برافروختہ کردیا، انھوں نے اخبار مذکور سے اور زیادہ اسلام موافق بیان دینے کا مطالبہ کیا۔ ترقی پسندوں نے کہا کہ اتنا کافی ہے کہ خلق "اسلام مخالف ہونے سے انکار کرتا ہے" حالانکہ اخبار خلق نے نجی ملکیت ختم کئے جانے کا مطالبہ کیا تھا جو اسلامی اصول اور ملکی آئین کے صریح خلاف ہے، یہ ہنگامہ ۲۴ مئی کو اس وقت فرو ہوسکا جب اٹارنی جنرل نے پریس قوانین کے خلاف ورزی کے جرم میں "خلق" پر پابندی عائد کردی،

افغانستان میں طلبہ کے ذریعہ پہلا فساد اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ہوا جب نئی پارلیمنٹ کا آغاز ہوا تھا، اس کے نتیجہ میں وزیر اعظم یوسف کو اپنے عہدہ سے ہٹنا پڑا، ان فسادات میں بائیں بازو کا ہاتھ ہونے کا شبہہ تھا، اس سے مذہبی طبقہ کو اس وقت بہت تقویت حاصل ہوئی، آئین اگرچہ سیکولر انصاف مہیا کرنے کا مدعی ہے لیکن قاضی زیادہ تر مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرتے ہیں، اس لئے ابھی اقتدار کو صحیح معنوں میں سیکولر ججوں کے ہاتھوں میں آنے کے لئے کافی عرصہ درکار ہے، حال میں افغان گورنمنٹ نے خود اعتراف

کیا ہے کہ وہاں ۲۶ ہزار مقدمات سماعت کے لئے پڑے ہوئے ہیں:

آئین کی دفعات (۱۰۵)، (۱۰۶)، (۱۰۷)، اور (۱۲۷) شاہ کو ایک سپریم کورٹ قائم کرنے کا اختیار دیتی ہیں، گورنمنٹ اٹارنی جنرل کا دفتر قائم ہوچکا ہے، جو مقدمات کی تفتیش اور ضروری قانونی کارروائی کرے گا لیکن وزارت انصاف اور وزارت داخلہ کے مابین قانونی اقتدار کی تقسیم پر سمجھوتہ نہ ہونے کے سبب سے یہ دفتر ابھی تک اپنا کام باقاعدہ شروع نہیں کرسکا ہے،

بہر حال سیکولر نظریات کی شاہراہ اور قومی حکومت کا چلانا آسان چیزیں نہیں ہیں پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ افغانستان سیکولر نظریات کی راہ پر گامزن ہے ترقی کی یہ رفتار تھوڑی دیر کے لئے آہستہ کیجا سکتی ہے، اور اس کی طاقت کو مختلف سمتوں میں منتشر کیا جا سکتا ہے لیکن اُسے مکمل طور سے روکا جانا ممکن نہیں، جب تک فوجی انقلاب نہ ہوجائے، افغانستان کا اصل مسئلہ مذہبی علماء کو سیاست سے الگ رکھنے کا نہیں، بلکہ سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کا ہے، کسی زمانہ میں افغانستان عالم اسلام کا سب سے پسماندہ اور قدامت پرست ملک شمار ہوتا تھا، لیکن اگر اُس کی ترقی کی موجودہ رفتار قائم رہتی ہے تو وہ ان اسلامی ممالک کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوگا، جو اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے سیکولر نظریات اپنانے کے خواہش مند ہیں،

(ڈاکٹر لوئس ڈوپری نمائندہ امریکن یونیورسٹی، کابل)

ہماری بادشاہی

یعنی آغاز اسلام سے لیکر عرب و ایران و ترکستان و افغانستان و ہندوستان و روم و اندلس کی اسلامی سلطنتوں کی مختصر تاریخ، (مولفہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی) "منیجر"

قیمت: للعہ

وفیات

ڈاکٹر سیّد محمودؒ

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جناب ڈاکٹر سید محمود......... کو........ مرحوم......... لکھتے وقت قلم تھرتھرا رہا ہے، ہاتھ کانپ رہا ہے، دل رو رہا ہے، اُن کی وفات غیر متوقع نہیں ہوئی، انھوں نے کافی عمر پائی، ریڈیو اور اخباروں میں تو اُن کی عمر ۸۲ سال بتائی گئی ہے، مگر وہ غالباً اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے، لمبی عمر پائی، مگر وہ خود بھی دنیا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، اور نہ ہم لوگ ان سے اتنا جلد جدا ہونا چاہتے تھے، وہ مئی کے آخر میں اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی پوتی سے پیار محبت کی باتیں کر رہے تھے، کہ اٹھے اٹھنے میں پوتی سے ٹکرا کر قالین پر گر پڑے تو اُن کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسپتال لے جائے گئے، لیکن یہی موت کا بہانہ بن گیا، ٹوٹی ہوئی ہڈی علاج سے تو درست ہوگئی۔ مگر اور دوسرے امراض پیدا ہوتے گئے، پیشاب بند ہوگیا، آپریشن ہوا، ربر کی نلکی سے پیشاب جاری کیا گیا، بیہوش رہنے لگے، نلکی کے ذریعہ غذا پہنچائی جانے لگی، ہوش آجاتا، تو پہلے کی طرح باتیں کرنے لگتے، صحت کی امید بندھنے لگتی، اُن کے تمام اعزہ و اقربا، اُن کی عیادت کو جمع ہوگئے، اُن کی ایک صاحبزادی پاکستان میں ہیں، وہ آگئیں، اُن کے ایک صاحبزادے سید احمد جرمنی میں ہیں، وہ بھی آگئے، وہ دارالمصنفین کے بہت بڑے سرپرست اور مربی رہے،

گذشتہ ۵۰ سال سے اُن کے تعلقات اس ادارہ سے تھے، اس لئے میں اور شاہ صاحب دونوں ۲۱ر جولائی کو اُن کی عیادت کے لئے دہلی پہونچے، وہاں تین روز قیام رہا، لیکن وہ ہوش میں نہیں آئے، اُن سے کوئی بات نہ ہوسکی اور نہ ان کو معلوم ہوسکا کہ ہم لوگ اُن کی محبت و شفقت کا حق ادا کرنے آئے ہیں، تین روز کے بعد ہم لوگ بڑی افسردگی کے ساتھ ان کے اعزہ سے رخصت ہوکر واپس ہوگئے، خطوط کے ذریعہ اُن کی حالت معلوم ہوتی رہی کبھی امید زیست ہوجاتی لیکن ۲۸ر ستمبر کی صبح کے ریڈیو سے یکایک خبر ملی، کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، آنکھیں اشک بار ہوئیں، دل رو دیا، رواں رواں رویا، رونے کے اسباب تھے، ادھر گذشتہ دس بارہ سال سے انھوں نے دارالمصنفین کو اپنی توجہ اور محبت کا خاص مرکز بنایا تھا، اور بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کے سرمایہ محفوظہ کے لئے کئی لاکھ روپیہ اپنی مساعی جمیلہ سے جمع کرکے رہیں گے، اسی کوشش کے سلسلہ میں سودی عرب کے سفیر کے ذریعہ سے پچاس ہزار روپیہ دارالمصنفین کو دلوائے، پھر اسی اکتوبر میں مجھ کو اپنے ساتھ لیکر کویت تشریف لے جانے والے تھے، اس سفر کے لئے تیاری بھی شروع کردی تھی، لیکن خداوند تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیاوی سفر کرنے کے بجائے سفر آخرت کریں، انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ اب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین چلے آئیں گے جہاں رہکر وہ اپنے علمی کاموں کی تکمیل کریں گے لیکن یہ ارمان انکے دل ہی دل میں رہ گیا اور وہ سپرد خاک ہوگئے، ان کی وفات سے دارالمصنفین والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا ایک بڑا سہارا ہی نہیں اٹھ گیا، بلکہ بے سہارا ہوگیا۔ جنازے میں ہم لوگوں کی شرکت ممکن نہ تھی، ریڈیو سے خبر ملی کہ شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، جنازے میں کافی لوگ تھے، وزرا بھی، سفرا بھی، صدر جمہوریہ ہند کی بھی

نمایندگی تھی، وزیر اعظم اندرا گاندھی روس میں تھیں، لیکن وہیں سے ان کا پیام تعزیت شائع ہوا، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی، بہت اونچا سنتے تھے، فیل پا کی وجہ سے زیادہ دور تک پیدل نہیں چل سکتے تھے، لیکن سفر اور کام کرنے میں جوانوں کو مات کرتے، سفر میں گرمی، سردی، دن، اور رات کا مطلق خیال نہ کرتے، ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کا سفر بے تکلف کر لیتے، مسز اندرا گاندھی سے اپنی بیٹی ہی کی طرح محبت کرتے، گذشتہ انتخاب میں اُن کی خاطر اپنی آخری علالت سے گویا تین مہینے پہلے یو۔ پی۔ اور بہار کا سفر ایک طوفانی پروگرام کے ساتھ کیا، دہلی سے لکھنو، رائے بریلی، فیض آباد، جونپور، غازی پور، پٹنہ، مظفر پور، چھپرہ کا دورہ چند روز میں ختم کر لیا، اُن کے ساتھی تو تھک کر اُن کو چھوڑتے گئے، لیکن وہ تازہ دم دہلی واپس ہوئے، پھر فوراً اپنے نجی کاموں کے لئے دیوریا، غازی پور، اعظم گڈھ، اور جونپور آئے، یہاں سے واپس ہوئے، تو جیسا کہ ذکر آیا ڈرائنگ روم میں اتفاقاً گر پڑے، اور گرے تو پھر نہ اُٹھے، وہ تقریباً پانچ مہینے ولنگڈن اسپتال میں رہے، اتنی طویل علالت میں لوگوں نے اُن کو نظر انداز نہیں کیا، اُن کی عیادت کے لئے صدر وی۔ وی۔ گری۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی، اور شہر کے اکابر، علماء، اور صلحا برابر آتے رہے، سعودی عرب کے سفیر اُن کی عیادت کے لئے آئے، تو اُن کے اعزہ سے فرمایا کہ دنیا میں اگر کوئی بیش قیمت دوا ایسی ملتی ہو جس سے اُن کی صحت ہو جائے، تو وہ منگوا لی جائے، اس کے اخراجات وہ برداشت کریں گے، لیکن کارکنانِ قضا و قدر کی طرف سے پیامِ اجل چل چکا تھا، اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکی، اور وہ اپنے عزیزوں اور عقیدت مندوں کو اپنا غم منانے، اور اپنی خوبیاں یاد کرنے کیلئے چھوڑ گئے،

اس مضمون میں ان کی سوانح عمری یا ان کے سیاسی حالات لکھنے کا ارادہ نہیں ہے،

وہ مجھ سے برابر کہتے رہے، کہ جب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین میں قیام کریں گے تو مجھ کو اپنی سوانح عمری اوٹوبیا گرافی کے انداز میں ڈکٹیٹ کرا دیں گے، لیکن یہ نہ ہو سکا، جس کا افسوس ہے، اُن کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور خیالات قلم بند ہو جاتے، تو اُن کے دور کی سیاسی اور ملی زندگی کی بہت ہی قیمتی دستاویز ہو جاتی، راقم زیادہ تر مضمونوں میں اپنے تاثرات کا اظہار کر گیا، گذشتہ بارہ تیرہ سال سے وہ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے تھے، دارالمصنفین آتے تو بارہ ایک بجے رات تک اپنے پاس بٹھائے رکھتے، اور ہر قسم کی باتیں کرتے رہتے، کبھی اپنے خاندانی حالات کا ذکر کرتے، کبھی اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے، کبھی اپنے معاصروں کا ذکر چھیڑ دیتے، کبھی ہندوستان کے گذشتہ سیاسی واقعات پر تبصرہ کرنے لگتے، کبھی اپنی خاص خاص تحریروں کے حوالے دیتے، کبھی جن جن تحریروں میں ان کا ذکر آیا ہے، اُن کی نشاندہی کرتے، ان ہی تمام باتوں کی روشنی میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں،

ان کی ولادت غازی پور کے ایک مردم خیز گاؤں سید پور بھتری میں ہوئی، اُن کے خاندان میں دولت کے ساتھ علم اور مذہب بھی برابر رہا، مشائخ بھی گذرے، اکبر بہار اور بنگال کی فتح کے لئے آگرہ سے چلا تو سید پور بھتری سے گذرا، اُس وقت اس خاندان میں دو مشہور بزرگ بندگی شاہ جمال اور بندگی شاہ محمود تھے، اکبر نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، تو انھوں نے ملنے سے انکار کیا، مگر چند عدد بیریں بھیج دیں، اکبر اس تحفہ کو فال نیک سمجھا، وہ واپسی میں پھر سید پور بھتری سے گذرا، تو اس خاندان کے لئے ایک جائداد وقف کی، جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، ڈاکٹر صاحب کے دادا جناب قاضی فرزند علی نے اپنی وفات کے وقت ڈھائی لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد چھوڑی تھی، وہ رئیس ہونے کے ساتھ بڑے مذہبی بھی تھے، مکہ معظمہ حج کے لئے گئے تو وہاں سے حضرت علی

کے پیراہن کھڑاؤں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور ہرن کی سینگ خطا کوفی میں لکھا ہوا کلام پاک کا ایک نسخہ ساتھ لائے، ان تبرکات کی نمایش گاؤں میں برابر ہوتی رہی، مولانا وارث علی شاہ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی کے استاد تھے، ایک بار وہ اس گاؤں میں آئے، تو ان تبرکات کو دیکھا تو ان پر جذب کا عالم طاری ہو گیا، ایک چیخ مار کر بولے واللہ یہی چیز ہے، یہی چیز ہے، حفاظت کرو، حفاظت کرو، اسی کے بعد انھوں نے بیعت وارادت کا سلسلہ شروع کیا، ڈاکٹر صاحب کے دادا حضرت سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے بھی متاثر تھے، انھوں نے اپنے ایک لڑکے یعنی ڈاکٹر صاحب کے بڑے چچا کو جہاد کے لئے حضرت سید احمد شہیدؒ کے سپرد کر دیا، ایک موقع پر انھوں نے اُن کی خدمت میں ایک لاکھ کی رقم بھی پیش کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کو بھی اُن سے بڑی محبت تھی، جب وہ حج سے واپس ہوئے، تو غازی پور کے ایک گاؤں میں پہونچے، یہاں پہونچتے ہی فرمایا، "بوے دوست می آید، بوئے دوست می آید" یہ کہکر یوسف پور کی طرف پاپیادہ چل کھڑے ہوئے، جہاں اُس وقت ڈاکٹر صاحب کے دادا علیل تھے اس علالت کے باوجود انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کیا، ان کو غازی پور لے گئے، اُن کے پورے قافلے کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بہت سے تحفے تحائف ساتھ کئے، اس سے متاثر ہو کر سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا، تم نے میرے دوست کو دیکھا،

ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد ملا سید محمد عمر صاحب نے خالص دینی تعلیم پائی تھی، اسی لئے ان کے نام کا جزملا ہو گیا تھا، وہ مولانا عبد العلیم آسی غازی پوری کے تلامذہ میں تھے، راہِ سلوک پر بھی گامزن ہوئے، اور حضرت قطب الہند شاہ غلام معین الدین عرف شاہ امید علی

سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور سے بیعت کی، ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد بزرگوار سے مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت وراثت میں ملی صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے، آخر زمانہ میں تو اوراد و وظائف کا بھی شغل رکھنے لگے تھے، فیل پا کی وجہ سے اُن کو اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی، مگر چوکڑی مار کر بیٹھے بیٹھے نمازیں پڑھتے، سجدے کرنے میں ان کے پاؤں میں تکلیف ہوتی تھی، تکلیف گوارا کر لیتے، دار المصنفین آتے، یا میں خود اُن کے یہاں کبھی مہمان ہوتا، تو رات کو بھی اُٹھ کر اُن کو نمازیں پڑھتے دیکھتا، اُن کے پاس دعاؤں کا ایک مجموعہ تھا جس میں قرآنی آیتیں اُن کو وہ روزانہ پڑھا کرتے، کچھ تو اُن کو زبانی یاد تھیں، اور کچھ دیکھ کر پڑھتے، ایک روز فکر لگے، کہ ان دعاؤں کو پڑھتے وقت خیال آیا کہ معلوم نہیں صحیح بھی پڑھتا ہوں یا نہیں، بارگاہ ایزدی تک پہونچتی بھی ہیں یا نہیں، ایک رات یاس و حسرت کے انہی جذبات کے ساتھ سو گیا، تو خواب میں دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوں، اور آپ فرما رہے ہیں کہ جو دعائیں پڑھتے ہو اُن کو جاری رکھو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آنکھیں کھلیں تو اپنے کو پسینے میں شرابور پایا، انھوں نے کئی اور مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، وہ ملک میں شیعہ سُنی کے فسادات سے بہت آزردہ خاطر رہتے، اسی آزردگی میں ایک رات جو آنکھ لگی تو دیکھا کہ ایک مختصر مجمع ہے، فرش و فروش لگے ہوئے ہیں، حضور سرورِ دو عالم تشریف فرما ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے ہیں، مجمع سے دو آدمی اُٹھے، انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے حضرت علیؓ کی کچھ شکایت کرنے کی کوشش کی، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا وہاں لائی گئیں، وہ ایک سفید چادر میں ملبوس تھیں، حضرت سیدہؓ کا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا گیا، دونوں کا نکاح پڑھا گیا، لیکن یکایک دیکھنے میں آیا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا

بکس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر رکھا ہوا تھا، اس میں کسی نے آگ لگا دی، اس
میں سے چھوٹی چھوٹی تیتلیاں نکل کر ناچنے اور آپس میں لڑنے لگیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو سخت ناگوار ہوا، وہاں سے آپ اٹھ کر دور جا کر تشریف فرما ہوئے،

ڈاکٹر صاحب نے اس خواب کا ذکر کر کے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا
تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے آپ کا کیا تعلق ہے، تیتلیوں کے جھگڑنے سے مراد شیعہ
سنیوں کے باہمی جھگڑے ہیں، اور آپ کا وہاں سے اُٹھ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے
جھگڑے سے اسلام کی جو تضحیک و تذلیل ہو رہی ہے اس سے آپ کو سخت تکلیف ہو رہی ہے
اور آپ ناراض ہیں، اس خواب کا ذکر انھوں نے اس پمفلٹ میں بھی کیا ہے، جو انھوں نے
شیعہ سُنی کے اتحاد کے سلسلہ میں سُنی مسلمانوں سے ایک دردمندانہ اپیل" کے عنوان سے ہندوستان
کے مشاہیر کے دستخطوں کے ساتھ شائع کرایا تھا، لیکن اس میں اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا،

ان کو اپنی مذہبیت کی بنا پر کلام پاک سے بڑا شغف رہا، جب تک اُن کی بینائی
کام کرتی رہی، اس کی تلاوت بھی کرتے رہے، اس کی تفسیر بھی پڑھتے، اس کے پڑھنے اور
سمجھنے سے متعلق اُن کے جو خیالات تھے، اس کا اظہار دار المصنفین کی مجلسوں میں برابر کرتے
رہتے، کہتے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے، وہ اسلام کو
قرآن پاک کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنے ماضی قریب کی روایات ہی
کو اسلام سمجھتے ہیں، قرآن پاک کا تخاطب ساری انسانیت سے ہے، لیکن ہم نے غیر حکیمانہ
طور پر اس کو صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھ رکھا ہے، اسی لئے ہمارے علماء نے اللہ
تعالیٰ کو رب المسلمین بنا دیا ہے، وہ رب العالمین بنا کر پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں، انھوں نے اپنا
کے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ افسوس ہے کہ ہندوستان میں شیخ عبدہ اور شکیب ارسلان

جیسی شخصیتیں نہیں پیدا ہوئیں، جو قرآن پاک کی آیات کی روشن تعبیر کرتیں اور اس دور کے
مسائل کی گرہیں کھولتیں، قرآن مجید کی آخری تفسیر و تشریح کبھی نہیں ہو سکتی، یہ بڑا معنی خیز،
جامع العلوم اور عظیم المرتبت کلام ہے، ہر دور میں یہ سائنٹفک حقائق سے ہم آہنگ
رہا ہے، ہر دور کے محقق اور سائنس دان نے اس کے اندر وہ صداقتیں دیکھی ہیں جو
کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی
صلاحیت پیدا کریں"، اپنی وفات سے چار مہینے پہلے اپنے ایک مضمون میں یہ تحریر فرمایا:-

"کلام پاک کو اس سائنٹفک دور میں سائنٹفک طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک
یوروپین سائنسداں نے لکھا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے صرف عربی کا جاننا کافی
نہیں، سائنس کے علوم کو بھی جاننا لازمی ہے، موجودہ دور کے سائنس دانوں
نے یہ اعلان کیا ہے کہ اوپر کے سیاروں تک پہونچنے میں دور حاضرہ کی بجلی کام نہیں
دے سکتی، اس لئے وہ اور طاقت ور بجلی کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں، اگر
ہمارے رسول صلعم کی معراج جسمانی تسلیم کر لی جائے، تو کیا عجب ہے کہ اُن کا
براق در اصل وہی برق ہو جس کے انکشاف کی کوشش آج کل کے سائنسدان
کر رہے ہیں، اسی طرح کے اور بہت سے قرآنی اشارے ہیں، جو سائنس کے نہ
جاننے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے، قرآن کے الفاظ سخّر الشمس والقمر
کی تائید سائنس کے موجودہ انکشافات سے ہو رہی ہے، اسی لئے قرآن پاک
کو سمجھنے کے لئے سائنس کے علوم کی واقفیت ناگزیر ہو گئی ہے، یاد آتا ہے کہ
سر شاہ سلیمان نے اپنی سائنسی تحقیقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ سائنس کے انکشافات
جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے، اتنا ہی ذات باری کا یقین بڑھتا جائے گا،

خدا کے وجود کے متعلق شکوک اس لئے ہیں کہ ابھی سائنس کی تحقیقات مکمل نہیں
ہو سکی ہیں ،......... قرآن پاک میں ذوالقرنین کے متعلق جیسی باتیں لکھی ہوئی
ہیں ، وہ موجودہ تحقیقات سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں ، قرآن پاک کا یہ دعویٰ
کہ اس کی تعلیم ہر زمانہ کے لئے ہے مزید تحقیقات سے اور بھی مستحکم ہو جائے گا ،"

اُن کو اس کی بھی لگن رہی کہ قرآن پاک کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ عام کیجائیں ، حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف نے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا ، اور ایک سوسائٹی کی تشکیل کر کے قرآنی تعلیمات کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ ترویج دینے کی اسکیم بنائی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی کوششوں سے ان کے لئے ایک گرانقدر رقم فراہم کرائی ،

اُن کو اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے صوفیائے کرام سے بھی بڑی عقیدت رہی ، کہا کرتے کہ مجھکو بچپن میں حضرت قطب الہند مولانا غلام معین الدین (عرف شاہ امید علی) کی گود میں کھیلنے کا فخر حاصل ہوا ، جونپور جاتے تو ان کی خانقاہ میں ضرور حاضری دیتے ، اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے ، ان کی خواہش یہی رہی کہ وہ اپنی وفات کے بعد جونپور ہی میں سپرد خاک ہوں ، اس سلسلہ کے بزرگوں کے قبرستان میں اپنی جگہ بھی متعین کر دی تھی ، مگر مشیت ایزدی کچھ اور تھی ، ایک بار میں ان کے ساتھ جونپور میں تھا ، تو اس قبرستان میں اُن کے ساتھ گیا ، یہیں ان کے والد بزرگوار اور والدہ بھی مدفون ہیں ، اپنے والدین کی قبروں کے علاوہ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر علٰحدہ علٰحدہ جا کر غایت عقیدت و احترام سے فاتحہ پڑھتے رہے ، دارالمصنفین آتے تو صوفیائے کرام کے واقعات شوق سے سنتے ، اور خود بھی بیان کرتے ، ایک روز میری کتاب بزم صوفیہ سے حضرت

نصیر الدین چراغ دہلوی کے حالات شروع سے آخر تک پڑھوا کر سنے ، اور جب میں نے ختم کر کے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ،

اُن کو اپنے والد بزرگوار کے استاد شاہ عبدالعلیم آسی سے بھی بڑی عقیدت رہی ، کہتے تھے اُن سے بیعت تو نہیں ہوا لیکن اُن کا صحبت یافتہ ہوں ، مگر اپنی بعض تحریروں میں اُن کے نام کے ساتھ پیر و مرشد بھی لکھا ہے ، ان کے کلام کے مجموعہ کو سفر میں برابر ساتھ رکھتے ، اس مجموعہ کے بہت سے اشعار اُن کو زبانی یاد تھے ، جو سنایا کرتے ، پھر بھی تشفی نہ ہوتی ، تو مجموعہ سے اشعار پڑھوا کر سنتے ، دارالمصنفین کے قیام کے زمانے میں ایک رات اپنی اٹیچی سے کلام آسی نکال کر مجھ کو دیا ، اور کہا کہ اس کو پڑھ کر سناؤ ، میں نے یہ مجموعہ کھولا ، تو یہ غزل پڑھنے لگا .

کبھی میری بھی تجھے چاہ تھی ، ترے دل میں میری بھی راہ تھی
کبھی اس طرف بھی نگاہ تھی کہ یہ سب خیال ہے خواب ہے

دلِ مبتلا ہے ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر
کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے

یونہیں اپنے کوچہ میں رہنے دے نہ عبث اٹھا کے ستا مجھے
جو اٹھے تو درد جگر اٹھے کہیں مجھ میں اٹھنے کی تاب ہے

اگر آنکھ کھولو تو کچھ نہیں اثر وجود بجز فنا ،
ہے سواد ہستی بے بقا کہ بیاض چشم حباب ہے

ہر شعر پر وجد کرتے کبھی تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے ، کبھی اٹھ بیٹھتے ، ہر شعر کو سمجھاتے بھی جاتے ، کہتے کہ اشعار میں تغزل ، موسیقی ، جذبہ سب کچھ ہے ، پھر کہا کہ اسی قافیہ اور ردیف میں کیفِ عشق کے عنوان سے بھی اُن کے اشعار ہیں ، وہ بھی پڑھو ،

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیفِ شراب ہے

لبِ یار چومے تھے خواب میں وہی جوشِ مستیِ خواب ہے

وہی پیشِ چشم ہیں ہر نظر مگر اب بھی شوقِ نقاب ہے

وہی میری ہر رگ و پے میں ہیں مگر اب بھی مجھ سے حجاب ہے

انھیں کبر حسن کی نخوتیں مجھے فیضِ عشق کی حیرتیں

نہ کلام ہے نہ پیام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

ان کو مولانا آسی کے مجموعۂ کلام کے تمام عنوانات یاد تھے، کبھی کبھی اُس کے صفحے بھی بتا دیتے، کہتے کہ مولانا آسی کے بہت سے اشعار میں کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث کی طرف اشارہ ہے، پھر وحدت الوجود پر ان کے اشعار سناتے رہتے، اس شعر کو بار بار پڑھتے:

بجز تمھارے کسی کا وجود ہو یہ محال مگر تمھیں نظر آنے ہو ماسوا ہو کر

مولانا آسی کے یہ اشعار بھی انھی کی زبان سے سُنے:۔

بلندی اُس کی اسی کی پستی ہر ایک شے میں اسی کی ہستی

عروج اُسی کا رسول ہو کر، نزول اسی کا کتاب ہو کر

ان کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی، پھر اپنے بہنوئی سید محمد عمر صاحب کے ساتھ بنارس چلے گئے، یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے اُن کے والد کی مرضی کے خلاف انگریزی تعلیم دلائی شروع کی، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان کو مولانا شبلی کی تصانیف سے دلچسپی ہوئی، پھر یہ دلچسپی عقیدت میں ایسی تبدیل ہوگئی، کہ ان کے شاگردوں سے بھی گہرے تعلقات پیدا کیے، اور پھر دار المصنفین سے وابستہ ہوتے تو اس سے ہر طرح کی محبت کا اظہار کرتے رہے، وہ مولانا شبلی کو بہت بڑا عالم، ادیب، مورخ، شاعر سمجھتے تھے، ان کی

بصیرت، فکر اور نظر کے بہت قائل تھے، سیرۃ النبی اور الفاروق کی بہت تعریف کرتے، البتہ مضامین عالمگیر کی بعض باتوں سے اختلاف کرتے، کہتے کہ یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے اورنگزیب کے خلاف جو زہر پھیلایا گیا ہے، اس کا یہ تریاق ہے، مگر مولانا نے اورنگزیب کو سراہنے میں کہیں کہیں شاہ جہان اور جہانگیر وغیرہ کو جو مجروح کیا، وہ نہ کرتے، تو اچھا تھا،

مولانا شبلی کو بھی اُن سے لگاؤ رہا، دونوں میں برابر خط و کتابت رہی، مولانا شبلی اُن سے علمی خط و کتابت بھی کرتے، اپنے خط میں ان کو محبی لکھتے، اور جب آخر میں مجلسِ تالیف سیرت قائم کی تو ان کا نام بھی اس میں رکھنا چاہا، مولانا شبلی کا ایک خط ان کے نام سے یہ ہے،

محبی! سلام شوق!

آپ سے تو میں نے امیدوں کا بڑا سلسلہ قائم کیا تھا، جو بیچ میں ذرا منقطع ہوگیا تھا،

یہ سچ ہے کہ جرمن پر نظر ڈالنی چاہئے لیکن نظر کہاں سے آئے، میں بالکل نیا ہوں، آپ جب ادھر کی پوچھائیں تو مجھ کو لکھیں، میں دو ایک مہینہ کے بعد ضرور آجاؤں گا، مرگولیس، نولدکی وغیرہ سے بہت کچھ نقل کرتا ہے لیکن وہ سب مضحکہ انگیز ہوتے ہیں، آج جو مقام زیر قلم تھا، وہ یہ کہ نولدکی نے آنحضرتؐ کا ذلیل النسب ہونا ثابت کیا ہے، دلائل سخت حیرت انگیز ہیں، قرآن مجید میں ایک آیت ہے

وقالوا لولا نزل هٰذا القرآن علىٰ رجل من القريتين عظيم | یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن دو شہروں میں کسی رئیس پر کیوں اترا

عظیم کا لفظ رئیس اور صاحب دولت و اقتدار کے لئے آتا ہے، اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور ریاست حاصل نہ تھی، اس بدنسبی

کہاں ثابت ہوتی ہے یہ تو لدیک کا استدلال ہے،

میں نے بعض فرنچ کتابیں پڑھی ہیں، رینان کا ایک رسالہ سبقاً پڑھا ہے عجیب حماقانہ باتیں پاتا ہوں رینان نے ثابت کیا ہے کہ علم اور اسلام جمع نہیں ہو سکتے، پورا رسالہ اسی بحث پر ہے

ذالک مَبلغھم مِنَ العلم ..... مجھ کو تو اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں

آپ کا خط جی چاہتا ہے الہلال وغیرہ میں شائع کر دوں کل یا جزاً

یہ میں چاہتا ہوں کہ مجلس تالیف سیرت میں آپ کا نام شامل کروں"

شبلی - لکھنؤ،

۱۵ راکتوبر ۱۹۱۲ء

۱۸۹۹ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے اٹاوہ بھیجے گئے جہاں مولوی بشیر الدین صاحب نے اپنا مشہور اسکول کھول رکھا تھا، انھوں نے کئی بار آثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ جب انھوں نے پہلی دفعہ مولوی بشیر الدین کو دیکھا تو ان کو مسلمانوں کا اتنا بڑا محسن سمجھنے کے بجائے اسکول کا کوئی ادنی ملازم سمجھا، وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے بے نیاز رہتے، خود سادہ رہ کر مسلمان طلبہ کو سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ ان سے ملے تو وہ دوڑ کر ایک ٹوکری میں چنے لائے، اور کہا کہ یہ ناشتہ تمھیں کرنا ہوگا، وہ اٹاوہ میں دو تین مہینے سے زیادہ نہ رہے، وہاں سے علی گڑھ چلے گئے، مگر مولوی بشیر الدین سے بہت متاثر رہے، کہتے کہ ان کے اخبار البشیر کی حیثیت اس زمانہ میں ٹائمس آف لندن کی تھی، وہ انگریزوں اور خصوصاً یو۔ پی کے گورنر کے خلاف برابر مضامین لکھا کرتے، ان کے اخبار میں کوئی اور صاحب ہندوؤں کے خلاف بھی مضامین لکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو اپنی

اس کم سنی میں بھی ان مضامین سے دکھ ہوا تھا، مولوی بشیر الدین کے یہاں روزانہ شام کو "جہل مرکب" کے نام سے ایک اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی، ڈاکٹر صاحب بھی اس اجتماع میں شریک ہونے لگے، انھوں نے اس میں ان مضامین پر سخت نکتہ چینی کی، ان کا خیال تھا کہ قومی تحریک کے لئے ایسے مضامین مضر ہوں گے اس ملک میں رہ کر ہندوؤں کو اپنے سے دور کرنے کے بجائے ان کو اپنے سے قریب تر کرنا ضروری ہے، اگر ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے شکوک ہیں، تو ان کو دور کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرتے رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اور بھی جو دلائل پیش کئے، ان سے مولوی بشیر الدین صاحب خوش ہوئے، اور وہ روزانہ اپنے ساتھ ان کو ٹہلنے کے لئے لے جاتے، ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جو کچھ کہا تھا وہی ان کے ذہن کا خمیر بنا رہا،

وہ ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کیلئے علی گڑھ گئے جہاں [illegible] اور درسگاہ کی محبت ان کے دل میں ایسی سرایت کئے ہوئی تھی، کہ آخر وقت تک اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہ کرتے، سرسید سے تو ان کو ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن وہ ان کو مسلمانوں کا بہت بڑا محسن سمجھتے، ان کے متعلق ان کے جو خیالات رہے، وہ ان کی اس تحریر کے ٹکڑے سے ظاہر ہونگے جو انھوں نے اپنی وفات سے پانچ مہینے پہلے لکھی، وہ لکھتے ہیں:

"سرسید سند یافتہ عالم تو نہ تھے لیکن ان کے جو کارنامے ہیں ان کی وجہ سے کینٹول اسمتھ نے ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، شبلی، حالی، نذیر احمد اور آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو نشاۃ الثانیہ عطا کی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو کے یہ عناصر اربعہ سرسید کے خیالات و تحریکات سے متاثر نہیں ہوئے، شبلی کا سلسلۂ ناموران اسلام

سرسید ہی کی صحبت کی وجہ سے شروع ہوا، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور لکچروں میں سرسید کے خیالات کی پوری عکاسی ہے اور آج یہ بحث جاری ہے کہ اُن کے ناول ابن الوقت کا ہیرو دراصل سرسید ہی کا کیرکیٹر ہے، ابن الوقت انگریزوں کے تمدن میں ضرور رنگ گیا ہے، لیکن اس کی خودداری اور غیرت کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ ضرور قابلِ قدر ہے، حالی نے گلِ گشتِ رندانہ اور نغمۂ مستانہ الاپنے کے بعد جب سرسید کو اپنا رہبر تسلیم کر لیا، تو پھر ان کا ملی درد، مذہبی جوش اور ایمانی ولولہ مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا، اور یہ وہ کتاب ہے، جس نے مسلمانوں میں غیر معمولی معاشرتی، تعلیمی، دینی اور مذہبی انقلاب پیدا کیا، اس کے مفید اثرات اس وقت تک باقی رہیں گے، جب تک مسلمان ہندوستان میں اردو پڑھتے رہیں گے یہ مسدس دراصل سرسید ہی کے جذبات کی صحیح تصویر ہے اور یہ ان ہی کا کارنامہ ہے، ہندوستان کی گذشتہ تین صدیوں کے اندر مسدس حالی جیسی کوئی اور کتاب گذشتہ تین صدیوں کے اندر ....

.... نہیں لکھی گئی جس سے مسلمان اتنا زیادہ متاثر ہوئے ہوں، اور انھیں ہر شعبۂ زندگی میں اتنے فوائد پہونچے ہوں، خود مولانا ابوالکلام آزاد سرسید کے کارناموں سے متاثر رہے، یہ اور بات ہے کہ اُن کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے، میں تو اقبال کو بھی سرسید ہی کی تحریکات کا علمبردار سمجھتا ہوں سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اس سائنٹفک اور اسٹیک دور سے پہلے کلام پاک کو سائنٹفک طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کی بنیاد ڈالی لیکن اُن پر کفر کے اتنے فتوے صادر ہوئے کہ اپنے کاز

کے مفاد کی خاطر اس کوشش کو بہت زیادہ بارآور نہ کر سکے، وہ کافر تو ضرور بنائے گئے لیکن انہی کے یہ اشعار بھی ہیں،

خدا دارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفےٰؐ دارم
ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم
ز جبریلِ امیں قرآن بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

"اپنے سینے میں اسلام کی آتش فروزاں رکھنے والا ہی یہ اشعار کہہ سکتا ہے"،

ان کی وطنی محبت کا جذبہ علی گڈھ میں اتنا اُبھرا کہ وہ وہاں قوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اپنی ایک تحریر میں اپنے زمانہ کے کالج کے ساتھیوں کو یاد کر کے لکھتے ہیں :-

"مہندر و پرتاب، تصدق احمد، حیات، جواہر لال (جواہر لال نہرو نہیں) مجید احمد، شیو پرشاد، باقی، محسن، شمشاد، مسعود، یہ سب طلبہ علی گڈھ کے مشہور کالج میں انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے، یہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے لیکن ایک دوسرے کے ہمدرد، غمخوار اور آپس میں سب دوست تھے، روزانہ شام کو مارین کورٹ (جہاں ان میں سے اکثر رہتے تھے) کے کمرہ نمبر ۳ میں جمع ہوتے تھے، اور دیر تک ہنستے بولتے اور آپس میں گپ شپ کرتے رہتے، مہندر و پرتاب، جواہر، شیو پرشاد ایک علٰحدہ بنگلہ میں رہتے تھے، جو بورڈنگ ہاؤس میں خاص کر ہندو طلبہ کے لئے متعین کر دیا گیا تھا، شام کو یہ سب دوست مل کر کبھی کبھی پرانے قلعہ کی طرف سیر و تفریح کے لئے چلے جاتے، اونچے درجہ کے طلبہ میں بھی (مثلاً عبدالرحمٰن (بجنوری) عزیز الرحمٰن، اور بدرالدین) ان کے

کچھ دوست تھے، عبدالرحمٰن ایم۔ اے میں پڑھتے تھے، اور عزیزالرحمٰن اور بدرالدین ایف اے میں، کبھی کبھی یہ دونوں بھی اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف مضامین پر گفتگو کیا کرتے تھے، ہندو پرتاب اپنے درجہ میں محنتی لڑکوں میں شمار ہوتے تھے، لیکن ان کو تاریخ نہیں یاد ہوتی تھی، اور نہ دل اپنا اس مضمون میں لگاتے تھے، جواہر اور احمد کو اپنے درجہ میں تاریخ سب سے اچھی یاد تھی، حیات اور شیو پرشاد کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، لیکن انگریزوں کے زمانہ کی تاریخ کو وہ شوق سے یاد کرتے تھے، تمام وائسراؤں کے شاندار نام ان دونوں کو ازبر یاد تھے، ہمارے میر ولایت حسین صاحب جن کا انتقال ۱۸ر جولائی ۱۹۴۹ء کو ہو گیا، تاریخ کے استاد تھے، ہر چند کوشش کرتے کہ ہندو پرتاب کو کسی طرح تاریخ یاد ہو جائے، تاکہ وہ امتحان میں کامیاب ہو جائیں، لیکن ان کی ساری کوششیں رائگاں جاتیں"۔

ہندو پرتاب سے مراد راجہ ہندو پرتاب ہیں، جو ابھی تک زندہ ہیں، اور انقلابی ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک جلاوطن رہے، تصدق سے مراد تصدق احمد شروانی ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور کانگریسی لیڈر اور یو۔ پی میں وزیر بھی رہے، عبدالرحمٰن سے مراد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہیں، جو غالبؔ پر اپنے ایک مضمون کی وجہ سے اردو ادب میں ایک مستقل جگہ بنا گئے ہیں، مجید سے مراد عبدالمجید خواجہ ہیں، جو بیرسٹر ہو کر کانگریسی لیڈر اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بھی ہوئے، حیات بعد میں لارڈ حیات کے نام سے مشہور ہوئے، وہ نواب بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری بنے، عزیزالرحمٰن جمعیۃ العلماء کے مشہور رہنما مولانا حفظ الرحمٰن کے بڑے بھائی تھے، بدرالدین انارکے

رہنے والے تھے، کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے، انھوں نے چھ جلدوں میں میرا اسپلا گنا کے نام سے ایک کتاب لکھی، اُن کا بعد میں قتل ہو گیا۔

ان کے ہم جماعت سرسید کے پوتے سر راس مسعود اور قاضی تلمذ حسین مصنف مرآۃ المثنوی بھی تھے، سر راس مسعود کو سیاست سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں رہی، اس کے باوجود دونوں کے تعلقات برابر خوشگوار رہے، البتہ قاضی تلمذ حسین اُن کی سیاسی سرگرمیوں کے ناقد رہے، اُن کے خلاف کچھ مضامین بھی لکھے،

علی گڈھ میں رفتہ رفتہ اُن کے ساتھیوں کا ایک ایسا گروپ بن گیا، جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف رہا، اس گروپ نے طلبہ پر انگریزوں کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کو وطنی محبت کے جذبے میں دور کر کے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، ان کے ہم خیال طلبہ نے ایک خفیہ سوسائٹی اخوان الصفا کے نام سے قائم کی، اس میں جو بحث مباحثے ہوتے، اس کا اندازہ ان کی کتاب "آج سے قبل کا ہندوستان" سے ہوگا، اس میں انھوں نے اپنے زمانہ کے علی گڈھ کے طلبہ کی گفتگو کے حوالے سے اُن کی ذہنیت کو بھی پیش کیا ہے، اس کتاب کا ذکر آگے آئے گا،

اس زمانہ میں ام۔ او۔ کالج میں انگریز اساتذہ میں مارسین، کارنا، اور براؤن تھے، اُن کے خلاف طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، تو انھوں نے اور مطالبات کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا، کہ بورڈنگ ہاؤس اور ڈرائنگ ہال انگریز اساتذہ کے سپرد نہ کئے جائیں، اور اگر وہ اساتذہ کی حیثیت سے نا اہل ثابت ہوں تو رعایت کے بغیر برطرف کر دئیے جائیں، یہ بے چینی ۱۹۰۷ء میں ایک اسٹرائیک میں منتقل ہو گئی، ڈاکٹر سید محمود نے اس میں نمایاں حصہ لیا، وہ اور طلبہ کے ساتھ کالج سے نکالے گئے، مگر اس سے اسٹرائیک کرنے والوں کی اور بھی زیادہ

بے چینی بڑھی، حکیم اجمل خاں بیچ میں پڑے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب چند طلبہ کے ساتھ اُردو ادب کے مشہور مصنف ڈپٹی نذیر احمد سے بھی جا کر ملے، ڈپٹی نذیر احمد اپنے خاص انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے، انھوں نے طلبہ سے ہمدردی کا اظہار تو ضرور کیا، مگر اور باتوں کے ساتھ یہ دلچسپ باتیں بھی کہیں،

"تم جانتے نہیں انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا، پیشاب لگے یا نہیں، ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا،

"بدمعاشو۔ سودیشی سوجھی ہے، سودیشی سوت کہاں سے آئے گا، کیا تمھاری خالائیں سوت کاتیں گی، انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہو"

اسٹرائک ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پھر کالج میں داخل کر لئے گئے، اور اس کے یونین پر انہی کا قبضہ رہا، جس سے انگریز اساتذہ ان سے بدظن رہے،

وہ اپنے کالج کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری، تصدق احمد شروانی اور خواجہ عبدالمجید سے زیادہ متاثر تھے، کئی بار مجھ سے کہا کہ فرصت ہوگی تو دارالمصنفین میں آکر ان دوستوں پر ایک مستقل کتاب لکھواؤں گا، میں بولتا جاؤں گا تم لکھتے جانا" ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی علمی اور ادبی صلاحیت کے بہت معترف رہے، اپنے ایک مضمون میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں،

"اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچانی تھی، اور جو کلام غالب کو ایسے حسن معانی کیا تھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس نے فلسفی ہونی، شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے آہ عبدالرحمن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک و قوم کی عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا"

میرا خیال ہے کہ ان ہی کی صحبت میں ڈاکٹر صاحب کو غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان کو غالب

کے بکثرت اشعار یاد تھے، اور اپنے بڑھاپے میں بھی اُن کا کلام سناتے تو سناتے ہی چلے جاتے، سنہ ۱۹۲۰ء میں غالب پر انھوں نے ایک مضمون لکھ کر اُن کے اشعار سے سیاسی نتائج نکالے جس سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی، اس کا ذکر آگے آئیگا، تصدق احمد شروانی کے صاحبزادہ جناب مصطفےٰ رشید شیروانی ہیں جو الٰہ آباد میں جیپ کمپنی کے مالک ہیں، اُن سے ڈاکٹر صاحب کے بہت ہی عزیزانہ تعلقات رہے، خواجہ عبدالمجید صاحب کے گھر والوں سے بھی آخر وقت تک اُن کا گہرا لگاؤ رہا،

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ان سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا نام بھی وائس چانسلری کے لئے اخباروں میں آیا، اسی زمانہ میں جب وہ علی گڈھ گئے، تو طلبہ ان کو ایک بہت ہی شاندار جلوس میں اسٹیشن سے یونیورسٹی لے گئے، انھوں نے اس موقع پر علی گڈھ سے اپنی محبت کا پورا اظہار کیا لیکن وائس چانسلری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا،

وہ علی گڈھ کے کسی اولڈ بوائے کی تعریف سنتے تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی، ایک بار دارالمصنفین میں ان کا قیام تھا، رات زیادہ گذر چکی تھی، میں اُن کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا، اثنائے گفتگو میں منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند جناب عنایت اللہ صاحب بی اے علیگ (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد) کا ذکر آگیا، میں اُنکے ساتھ دہرہ دون میں کچھ دنوں رہ چکا تھا اُن کی شرافت، اخلاق، وضعداری، نیت، مروت اور محبت کے کچھ واقعات سنائے، تو وہ سن کر بہت ہی خوش اور شگفتہ ہو گئے، جھومنے اور کہتے اُن کے کچھ اور واقعات سناؤ، بستر سے اُٹھ کر بیٹھ جاتے، اور کہتے کہ ان واقعات کو سنا کر تم نے میری آج کی رات کو کیسی خوشگوار بنا دی ہے، پھر یکایک دیکھا کہ اُن کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے، اور وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، جب پڑھ چکے تو کہا میں عنایت اللہ صاحب پر فاتحہ پڑھ رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے اُن کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگی ہیں،

ان کی وفات کے بعد ان پر اخباروں میں اب تک مضامین آرہے ہیں، ۹ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کے مدینہ بجنور

میں ان پر ایک مضمون "ڈاکٹر سید محمود کی کچھ یادیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں ہے:۔

"مسلم یونیورسٹی سے انھیں عشق تھا، اور ہر وقت وہ اس غم میں گھلا کرتے تھے، کہ یہ تعلیم گاہ کسی طرح سکولر دی دست برد سے بچے، جس زمانے میں مسٹر چھاگلا وزیر تعلیم تھے، انھوں نے لوک سبھا میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک انتہائی زہریلی تقریر کی، جس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ترقی پسندانہ اور سیکولر جذبات رکھتے ہیں، اسی لئے مسلمان ان کے مخالف ہیں، ڈاکٹر سید محمود راجیہ سبھا کے ممبر تھے، لیکن اس تقریر کو سننے کے لئے وہ لوک سبھا کی گیلری میں بیٹھے تھے، چھاگلا صاحب کی تقریر کو سن کر وہ گیلری میں زور زور سے غصے میں اپنا بید فرش پر مارتے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ جھوٹ ہے، بدمعاشی ہے، شرارت ہے، یہ بات لوک سبھا کے آداب کے خلاف بھی، لیکن کسی کو ان سے کچھ کہنے کی جرأت نہ تھی"

۱۹۰۷ء کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے، انگلستان میں ان کا قیام تین سال تک رہا، کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی گئے، وہاں ان کو تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی، عام طور سے مشہور رہا کہ انھوں نے مولانا شبلی کی کتاب مضامین عالمگیر کا جرمن زبان میں ترجمہ کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کر لی تھی، مگر یہ شہرت ان کے حریفوں نے دی، ورنہ حقیقت خود انھوں نے بیان کیا کہ انھوں نے "مغلوں کے سیاسی نظام سلطنت" پر مقالہ لکھا تھا۔

وہ انگلستان اپنی وطنیت کے جذبہ میں سرشار ہو کر انگریزوں کے خلاف ایک زہریلا ذہن لے کر گئے تھے، مگر وہاں کے قیام میں انگریزوں کی شرافت و اخلاق سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور یہ اثر ان کی زندگی کے آخری وقت تک رہا۔ مگر انھوں نے اپنے ذہن کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، سیاسی طور پر تو انگریزوں کے مخالف رہے، لیکن اس سے ہٹ کر

وہ انگریزوں کو ہر طرح پسند کرتے تھے، اُن کی قومی اور معاشرتی خوبیوں کے معترف رہے، انگلستان میں اپنے دو انگریز استاد پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور ولفرڈ بلنٹ سے زیادہ متاثر ہوئے، پروفیسر براؤن کو ایرانی ادب اور تہذیب سے بڑا شغف رہا، انھوں نے اپنی تصانیف (A history of persian Literature The press and poetry of Modern persia, and The wit and Humour of the persia کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ کیلئے ایک مستقل جگہ بنالی ہے، وہ ایرانی تہذیب کی دلدادگی میں کبھی کبھی ایرانی لباس پہنے اور ایرانی حقہ بھی پیتے دکھائی دیتے، مسٹر بلنٹ نہ صرف ممتاز اہل علم بلکہ سیاسیات اور خصوصاً مسلم ممالک کی سیاسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اپنی تصانیف Indiaunder-Ripon' Future of Islam اور The secret History of the English-Occupation of Egykt کے لئے ہندوستان اور اسلامی ممالک میں بہت مشہور رہے، ان کی شادی انگریزی زبان کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی نواسی سے ہوئی تھی، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن کے سمدھی بھی تھے، ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے، کلام پاک برابر مطالعہ میں رکھتے، کہتے کہ اسلام قبول کرنے کا دل چاہتا ہے، مگر مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو دیکھ کر مسلمان ہونے سے باز آجاتا ہوں، عربی پاشا کو جب پھانسی کی سزا دی گئی تو ان ہی کی کوشش سے وہ پھانسی کے تختے سے اترے، ان کو سیلون جلا وطن کر دیا

گیا تو مسٹر بلنٹ وہاں جاکر اُن سے ملے۔ مگر اُن کو وہاں مصریوں میں آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑا دُکھ ہوا، انھوں نے پانچ سال عرب میں بدوؤں کے ساتھ بھی گذارے تھے، عربی گھوڑوں کو پسند کرتے تھے۔ اُن کی برائی سننا پسند نہیں کرتے، ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے اُن کے سامنے کہدیا کہ انگریزی گھوڑے زیادہ تیز ہوتے ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا کہ مگر عربی گھوڑے زیادہ شریف ہوتے ہیں،

ڈاکٹر صاحب مسٹر بلنٹ کی خوبیوں کا ذکر برابر کرتے رہتے، انھوں نے اس کا بار بار اعادہ کیا کہ مسٹر بلنٹ ہی نے سیاسیات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا، اُن کی یہ تلقین کچھ ایسی موثر رہی کہ وہ سیاسیات میں ایمانداری کا ثبوت آخر آخر وقت تک دیتے رہے جس سے اور دوسرے رہنماؤں کی طرح وہ زیادہ کامیاب سیاست داں نہ ہو سکے۔ کہتے کہ کسی انگریز ہی نے کہا ہے کہ Consistency in politics is the virtue of an ass مگر وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خوش تھے، کہ سیاسی دیانت داری اور وضعداری کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی حال میں نہیں چھوٹا،، گو لوگوں کو اُن سے بہت کچھ اختلاف ہوتا رہا۔ ان کا بیان ہے کہ مسٹر بلنٹ اون سے برابر کہتے رہتے کہ

"ہندوستان کی قومی تحریکوں میں مسلمان برابر شریک ہوتے رہیں، ورنہ اُن کی حیثیت باعزت نہیں رہ سکے گی"

یہ نصیحت اُن کے ذہن پہ برابر چھائی رہی، (باقی)

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

بخشی ید قدرت نے ہر چیز کو زیبائی
پھولوں کو ملی نکہت تاروں نے چمک پائی

اس حسن مجسم کی اللہ رے رعنائی
بن جائے تماشا خود ہر ایک تماشائی

کچھ ایسی خبر گلشن میں باد سحر لائی
شبنم لگے بہنے آنسو پھولوں کو ہنسی آئی

کی لاکھ جگر کاوی، کی لاکھ جبیں سائی
تدبیر نہ ماتھے کی تحریر مٹا پائی

جب تک تھی سکونِ دل ہو دل کو تمنا تھی
جلتے ہوئے انگاروں پر بھی ہیں خنکائی

ہر پھول کو گلشن میں ہے دعوی رعنائی
حیراں ہے کہ دیکھے کیا کیا چشم تماشائی

تا مرگ نہ مٹ پایا جو درد ملا ہم کو
جو پھانس چبھی دل میں وہ پھر نہ نکل پائی

ہے فیضِ تبسم سے کس کی یہ فضا رنگیں
بستر سے یہ کون اٹھا لیتا ہوا انگڑائی

یہ دورِ زبوں حالی اور شوقِ غزلخوانی
بیٹھے ہو ولی لیکر بے وقت کی شہنائی

غزل

از جناب ڈاکٹر محمد نثار الرحمٰن خاں آشفتہ

خوش بخت وہی ہے وہی قسمت کا دھنی ہے
دولت جسے سوزِ غمِ الفت کی ملی ہے

بے تابی بہم سے ہے سر گرمیٔ ہستی
سرمایۂ جاں تاب و تب زندہ دلی ہے

راضی برضا رہنا ہے معراجِ محبت — مرنا رہِ الفت میں حیاتِ ابدی ہے

ہر دم یہ رہے دھیان کہ اک ہستیِ مطلق — ہر حال میں ہر وقت ہمیں دیکھ رہی ہے

ملتی ہے ہمیں اس سے بڑی دولتِ تسکین — کیا فیض رساں اپنا یہ دامانِ تہی ہے

بن بن کے جو بگڑے وہ ہے تقدیر ہماری — جو لاکھ بگڑ کر بھی بنے زلف تری ہے

ہرگز نہ تھی محفل میں لبِ گویا کے بس کی — وہ بات جو خاموش نگاہی نے کہی ہے

جینے کو بہرحال جئے جاتے ہیں لیکن — دوروزہ حیات ہم کو بہت لمبی پڑی ہے

تم فصلِ بہاراں کے امین ہو تو بتاؤ — کیوں آبِ رخِ لالہ و نسریں کی اڑی ہے

کچھ دل کو جلا کر ہی اُجالا کرو یارو — اک تیرگی سی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے

مستقبلِ دوراں کے ہیں [illegible] — گرمیِ عمل جن کے رگ و پے میں بسی ہے

غزل

از جناب بدر الزماں صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ

ایک لغزش باعثِ تکوینِ عالم بن گئی — نیکیاں کچھ اس طرح بدلیں کہ عصیاں ہو گئیں

ہم نہ کہتے تھے کہ یہ عالم فریبِ زیست ہے — ساری امیدیں سمٹ کر نذرِ حرماں ہو گئیں

حسن و روداد نہاں تھی حریمِ عشق میں — اک تڑپ تھی دل کی سب شمعیں فروزاں ہو گئیں

کون سمجھائے انھیں اس قلبِ مضطر کی فغاں — اُن کے اک ہلکے تبسم سے شگفتہ دل کی کلیاں ہو گئیں

الفتِ آدم کی راہیں خلد میں مستور تھیں — ایک لغزش نے نقاب الٹی تو عریاں ہو گئیں

طور اور موسیٰ کا قصہ رازدارِ عشق تھا — لن ترانی سے امنگیں حرفِ نسیاں ہو گئیں

کون کہتا کس سے کہتا قیس کی رودادِ عشق
چاک کی سب دھجیاں تارِ گریباں ہو گئیں

مطبوعاتِ جدیدہ

فی ملکوت اللہ، تالیف المعلم عبدالحمید الفراہی تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات ۴۰، قیمت ۶۲ نئے پیسے، پتہ: مکتبہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ

یہ رسالہ ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا دیباچہ اور ملکوت اللہ کی تشریح و وضاحت پر مشتمل ہے، اس میں علم ملکوت اللہ کی دین میں اہمیت، نفوس کی تربیت، اعمال کی اصلاح اور دینی و دنیاوی امور کے فہم میں اس کے فوائد اور عقلی، نقلی اور تاریخی حیثیت سے اس کا ثبوت پیش کیا گیا ہے، مصنف کے نزدیک خدا کی حاکمیت کے اعتقاد اور ملکوت اللہ کی معرفت کا اہم فائدہ حکومتِ الٰہیہ کے مطابق ان قوانین کی تشکیل ہے، جن سے دنیا امن و خیر کا گہوارہ بن جاتی ہے، خلافت کی بحث اور خلیفہ کے اوصاف کے ذکر میں بتایا گیا ہے کہ کب اور کیوں خدا اس نعمت سے کسی قوم کو سرفراز کرتا ہے، اور کیوں کسی قوم سے اس کو سلب کر لیتا ہے، حواشی میں جابجا ان مباحث سے ملتے جلتے نٹ نوٹ بھی ہیں، اگرچہ یہ رسالہ اصل تصنیف کا خاکہ اور اس سے متعلق منتشر یادداشتوں اور اشارات کا مجموعہ ہے، تاہم حقائق و معارف کا خزانہ اور مولانا کے تدبر فی القرآن کا نچوڑ ہے، اُن کی دوسری تصنیفات کی طرح اس کو بھی طلبۂ قرآن کے مطالعہ میں ضرور ہونا چاہئے، اس کی اشاعت ایک مفید علمی و قرآنی خدمت ہے،

رویتِ ہلال کا مسئلہ:- مرتبہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت

اچھی، صفحات ۱۴۴۔ قیمت: ؎ ، پتہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ ۔ لکھنؤ،

رویتِ ہلال کا مسئلہ دورِ حاضر کے ان اہم اور پیچیدہ مسائل میں ہے، جو مسلمانوں میں بڑے نزاع وانتشار کا باعث بنا ہوا ہے، اس پر ہند وپاک کے اصحاب علم وقتاً مختلف وقتوں میں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور ابھی تک اس موضوع پر اس قدر مبسوط اور جامع تحریر نہیں لکھی گئی، اس میں پہلے رویت کے مسئلہ میں شریعت کی اصل روح بیان کی گئی ہے، پھر قدیم فقہی کتابوں میں ریڈیو، ٹیلیفون، تار اور وائرلس کے نظائر تلاش کرکے ان کی روشنی میں ان جدید وسائل کے ذریعہ چاند کی خبروں کے ثبوت وعدم ثبوت پر محققانہ بحث کی گئی ہے، آخر میں مطالع کے متعلق فقہاء ومجتہدین کے پرانے اختلافات بیان کرکے اس عہد کے اعتبارات اس کی حد بندی کی گئی ہے، ہر بحث میں قدیم علماء وفقہا کیساتھ ساتھ جدید مفتیوں اور عالموں کے اقوال بھی تحریر کئے گئے ہیں، گو مصنف کے بعض قیاسات اور رایوں سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن یہ کتاب اُن کی تلاش وتحقیق اور فقہی بالغ نظری کا پورا ثبوت ہے، انھوں نے اس میں بڑے گوناگوں معلومات جمع کر دیئے ہیں، رویت ہلال کا مسئلہ عوام وخواص دونوں اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے الجھن کا باعث بنا ہوا ہے، لیکن یہ خالص فقہی وفنی بحث ہے، اور کتاب فقہی حوالوں سے اس قدر گرانبار ہے کہ اس سے علماء ہی پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں، آخر میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے اجلاس منعقدہ مئی ۱۹۶۷ء کی رویت ہلال کے بارہ میں منظور کردہ تجویز بھی درج ہے،

"ض"

جلد ۱۰۸ - ماہ شوال المکرم ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۱ء - عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات